گابریئل گارسیا مارکیز

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

انگریزی سے ترجمہ: فاروق حسن

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

گابریئل گارسیا مارکیز

انگریزی سے ترجمہ

فاروق حسن

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

گابریئل گارسیا مارکیز

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

(ناول)

انگریزی سے ترجمہ: فاروق حسن

پہلی اشاعت: 2021

آج کی کتابیں

316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی 74400

فون: 35650623 (21-92)

ای میل: ajmalkamal@gmail.com

cpkarachi2020@gmail.com

ویب سائٹ: www.citypressbooks.com

کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا

1

کافی کے ڈبے کا ڈھکن اٹھانے پر کرنل کو پتا چلا کہ ڈبے میں صرف چمچ بھر کافی باقی ہے۔ اس نے کیتلی کو چولھے سے اتارا اور اس میں سے آدھا پانی مٹی کے فرش پر گرا دیا، پھر وہ چاقو لے کر ڈبے کی دیواروں پر لگی ہوئی کافی کھرچنے لگا، کافی کے ساتھ زنگ بھی اتر اتر کر کیتلی میں گرنے لگا۔

جب کرنل، کافی اُبلنے کے انتظار میں، پتھر کے آتشدان کے سامنے مطمئن مگر معصوم توقع کے ساتھ بیٹھا تھا، اسے اپنی انتڑیوں میں کھمبیوں اور سوسن کے زہریلے پھولوں کے اُگنے کا احساس ہوا۔ اکتوبر کا مہینہ آن پہنچا تھا۔ یہ ایک دشوار صبح تھی، اُس جیسے شخص کے لیے بھی جو ایسی بے شمار صبحیں گزار چکا تھا۔ تقریباً ساٹھ برس سے، یعنی خانہ جنگی کے خاتمے کے بعد سے، کرنل نے سوائے انتظار کے کچھ نہ کیا تھا۔ اکتوبر کا مہینہ اس کے پاس آنے والی گنی چنی چیزوں میں سے ایک تھا۔

کرنل کی بیوی نے اسے کافی کا پیالہ اٹھائے خوابگاہ میں داخل ہوتے دیکھا تو مچھردانی کا کونا اٹھا دیا۔ پچھلی رات اسے دمے کا دورہ پڑا تھا اور وہ ابھی تک غنودگی کی حالت میں تھی۔ لیکن کافی کا پیالہ لینے کے لیے اٹھ بیٹھی۔

''اور تمھاری کافی کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں پی چکا ہوں،'' کرنل نے جھوٹ بولا۔ ''اس کے بعد بھی چمچ بھر کافی بچ رہی تھی۔'' اسی وقت گرجے کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئیں۔ کرنل جنازے کے بارے میں بھول چکا تھا۔ جب اس کی بیوی کافی پی رہی تھی، اس نے اپنے جھولا بچھونے کو ایک جانب سے اتار کر اور گول کر کے پیچھے رکھ دیا۔ عورت کو مرنے والے کا خیال آیا۔

''وہ 1922 میں پیدا ہوا تھا،'' وہ بولی۔ ''سات اپریل کو، ہمارے بیٹے کی پیدائش کے ایک ماہ بعد۔''

اپنے اکھڑے ہوئے سانسوں کے درمیانی وقفوں میں وہ کافی کے گھونٹ بھرتی رہی۔ اس کی خمیدہ، بے لوچ ریڑھ کی ہڈی پر بہت کم گوشت رہ گیا تھا۔ سانس لینے میں دشواری کے باعث اس کے سوالیہ فقرے بھی یوں لگتے تھے جیسے کوئی دعویٰ کیا جا رہا ہو۔ کافی ختم کرنے کے بعد بھی وہ مرنے والے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

''اکتوبر کے مہینے میں دفنایا جانا کس قدر ہیبت ناک ہوتا ہوگا،'' اس نے کہا۔ مگر اس کے خاوند نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ اس نے کھڑکی کھول دی۔ اکتوبر کا مہینہ گھر کے صحن تک آ پہنچا تھا۔ سبزے کی بالیدگی پر غور کرتے ہوئے، جو ہر جگہ گہرے سبز رنگ میں عیاں تھی، اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کو دیکھتے ہوئے، جو کینچوؤں نے ہر سمت بنا رکھے تھے، کرنل نے دوبارہ اپنی انتڑیوں میں اکتوبر کے نحوست زدہ مہینے کے وجود کو محسوس کیا۔

''میری ہڈیاں تک سیل گئی ہیں،'' اس نے کہا۔

''سردی کا موسم ہے،'' عورت نے جواب دیا۔ ''جب سے بارشیں شروع ہوئی

ہیں، میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ جرابیں پہن کر سویا کرو۔''

''ایک ہفتے سے تو پہن رہا ہوں۔''

بارش ہلکی ہلکی مگر لگاتار ہو رہی تھی۔ کرنل کا جی چاہا کہ اونی کمبل اوڑھ کر دوبارہ بستر میں جا لیٹے۔ مگر گرجے کی ٹوٹی ہوئی گھنٹیوں کی مسلسل آواز نے اسے جنازے کی یاد دلائی۔ ''اف یہ اکتوبر!'' اس نے سرگوشی میں کہا، اور کمرے کے وسط میں آ گیا۔ تب ہی اسے مرغ یاد آیا جو بستر کے پائے سے بندھا ہوا تھا۔ وہ ایک لڑاکا مرغ تھا۔

کافی کا خالی پیالہ باورچی خانے میں رکھنے کے بعد کرنل نے پنڈولم والی گھڑی کو، جو بیٹھک کی دیوار پر آویزاں تھی، چابی دی۔ خوابگاہ کے برعکس جو خاصی تنگ تھی اور جس میں دمے کے مریض کا سانس ناحق رُکنے لگتا تھا، بیٹھک کشادہ اور ہوادار تھی۔ کمرے میں ایک چھوٹی میز کے اردگرد چار مضبوط جھولنے والی کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر غلاف بچھا ہوا تھا اور اس پر مٹی کی بنی ہوئی بلی رکھی تھی۔ گھڑی کے سامنے والی دیوار پر ایک تصویر تھی جس میں ایک عورت نے باریک کپڑے کا سفید لباس پہن رکھا تھا، عورت کے اردگرد چھوٹے چھوٹے کیوپڈ گلابوں سے بھری کشتی میں بیٹھے تھے۔

جب کرنل نے گھڑی کو چابی دینا ختم کیا تو سات بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ وہ مرغ کو باورچی خانے میں لے گیا، اسے چولھے کے پائے سے باندھ کر اس نے ڈبے کا پانی تبدیل کیا اور مٹھی بھر مکئی اس کے سامنے رکھی۔ صحن کی باڑھ کے ایک سوراخ میں سے محلے کے چند بچے اندر آ گئے اور خاموشی سے مرغ کے اردگرد بیٹھ کر اسے کھاتے ہوئے دیکھنے لگے۔

''مرغ کو ایسے مت گھورو،'' کرنل نے کہا۔ ''مرغوں کو دیر تک یوں دیکھتے رہیں تو وہ گھس جاتے ہیں۔''

بچے وہیں بیٹھے رہے۔ ایک بچہ ماؤتھ آرگن پر ایک مشہور گانے کے سُر نکالنے لگا۔ ''آج اسے مت بجاؤ،'' کرنل نے اسے منع کیا۔ ''قصبے میں ایک موت ہوگئی ہے۔'' بچے نے باجا اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا، اور کرنل جنازے کے لیے تیار ہونے خوابگاہ میں چلا گیا۔

اس کی بیوی کے دمے کے دورے کے باعث اس کا سفید سوٹ استری نہ ہو سکا تھا، اس لیے کرنل کو اپنا پرانا کالا سوٹ ہی پہننا پڑا، جو شادی کے بعد سے اب تک اس نے صرف چند خاص موقعوں پر ہی پہنا تھا۔ بڑے صندوق میں کپڑوں کے نیچے اخبار میں لپٹے ہوئے اس سوٹ کو ڈھونڈنے میں کرنل کو کچھ دقت ہوئی، کیڑوں سے بچانے کے لیے صندوق میں نفتالین کی گولیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کرنل کی بیوی بستر میں دراز ابھی تک مرنے والے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

''اب تک وہ ہمارے آگستین سے مل چکا ہوگا،'' وہ بولی۔ ''ممکن ہے وہ ہمارے بیٹے کو یہ نہ بتائے کہ اس کے مرنے کے بعد سے ہمارا کیا حال ہے۔''

''اس وقت وہ دونوں شاید مرغوں کے بارے میں گفتگو کر رہے ہوں گے،'' کرنل نے کہا۔

سوٹ ڈھونڈتے ڈھونڈتے کرنل کو صندوق میں ایک بڑی سی چھتری نظر آ گئی۔ یہ کرنل کی بیوی نے اس قرعہ اندازی میں جیتی تھی جو کرنل کی پارٹی کے لیے چندہ اکٹھا

کرنے کی خاطر منعقد کی گئی تھی۔ تقریب کی رات، وہ گھر کے باہر بیٹھ کر تماشا دیکھتے رہے تھے جو بارش کے باوجود جاری رہا تھا۔ کرنل، اس کی بیوی اور ان کے بیٹے آگستین نے، جو اس وقت آٹھ برس کا تھا، اس چھتری کے نیچے بیٹھ کر آخر تک تماشا دیکھا تھا۔ اب آگستین مر چکا تھا اور چھتری کی چمکدار ساٹن میں کیڑوں نے سوراخ کر دیے تھے۔

''ہماری سرکس کے مسخروں والی چھتری کا دیکھو کیا حال ہو گیا ہے!'' کرنل نے اپنا پرانا فقرہ دہرایا۔ چھتری کو کھولنے پر اس کے اوپر بہت ساری پراسراری سلاخیں نمودار ہو گئیں۔ ''اب تو یہ صرف آسمان کے تارے گننے کے کام کی رہ گئی ہے۔''

وہ مسکرایا۔ مگر عورت نے مڑ کر چھتری کو دیکھنے کی زحمت نہ کی۔ ''ہر چیز کا یہی حال ہے،'' وہ سرگوشی میں بولی۔ ''ہم خود جیتے جی گل سڑ رہے ہیں۔'' اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تا کہ مرنے والے کے بارے میں پورے انہماک سے سوچ سکے۔

ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر شیو کرنے کے بعد، کیونکہ اس کے پاس عرصے سے کوئی آئینہ نہیں تھا، کرنل نے خاموشی سے کپڑے پہنے۔ اس کی پتلون، جو اس کی ٹانگوں پر لمبے زیر جامے کی طرح کسی ہوئی تھی اور ٹخنوں پر فیتوں سے گانٹھ لگا کر بند کی جاتی تھی، کمر پر گُردوں کے قریب اسی طرح کے فیتوں سے سنبھلی رہتی تھی جو ملمع کیے ہوئے دو بکسوؤں میں سے گزرتے تھے۔ کرنل پیٹی نہیں باندھتا تھا۔ اس کی قمیص جو مٹیلا کے پرانے کاغذ کے رنگ کی تھی اور اُسی جیسی سخت بھی، تانبے کے گول بٹن کے ساتھ کالر سے جوڑی جاتی تھی۔ قمیص کا الگ کالر اتنا بوسیدہ ہو چکا تھا کہ کرنل نے ٹائی لگانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

کرنل ہر عمل اس طرح کر رہا تھا جیسے کوئی ارفع کام انجام دے رہا ہو۔ اس کی

انگلیوں کے جوڑوں کی کھنچی ہوئی اور شفاف کھال پر سفید دھبے تھے جیسے اس کی گردن کی کھال پر تھے۔ اپنے نقلی چمڑے کے جوتے پہننے سے پہلے اس نے ان کی سیون میں گھسی ہوئی خشک مٹی کو کھرچ کر صاف کیا۔ اس کی بیوی نے اُس وقت اسے دیکھا، اس نے وہی لباس پہن رکھا تھا جو شادی کے روز پہنا تھا۔ تب ہی اس کی بیوی کو احساس ہوا کہ وہ کس قدر عمر رسیدہ ہو چکا ہے۔

''یوں لگتا ہے جیسے تم کسی خاص موقعے کے لیے بن سنور رہے ہو،'' وہ بولی۔

''یہ جنازہ ایک خاص موقع ہی ہے،'' کرنل نے کہا۔ ''برسوں بعد اس قصبے میں یہ پہلا آدمی ہے جو طبعی موت مرا ہے۔''

نو بجے کے بعد مطلع صاف ہو گیا۔ کرنل باہر نکلنے کے لیے تیار تھا جب اس کی بیوی نے اسے آستین سے پکڑ لیا۔

''بالوں میں کنگھی کر لو،'' اس نے کہا۔

کرنل نے اپنے فولاد کے رنگ کے سخت بالوں کو کنگھی سے بٹھانے کی کوشش کی، مگر یہ ایک ناکام کوشش تھی۔

''میں ضرور طوطے جیسا لگ رہا ہوں گا،'' اس نے کہا۔

عورت نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ طوطے کی طرح نہیں لگ رہا تھا۔ کرنل اکہرے جسم کا آدمی تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے اس کی ہڈیوں کا ڈھانچا نٹ بولٹ سے کس کر تیار کیا گیا ہو۔ لیکن اس کی آنکھوں میں جان تھی، جس کے بغیر وہ شاید فارمالین میں محفوظ کیا ہوا نمونہ لگتا۔

''تم ٹھیک لگ رہے ہو،'' اس نے جواب دیا، اور جب کرنل گھر سے باہر قدم رکھنے لگا تو اضافہ کیا، ''ڈاکٹر سے ملو تو پوچھنا کہ کیا ہم نے کبھی اس کے سر پر کھولتا ہوا پانی انڈیلا تھا؟''

کرنل اور اس کی بیوی قصبے کے سرے پر ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے جس کی چھت پر کھجور کے پتوں کا بنا چھپر تھا، اور دیواروں سے چونا گرتا رہتا تھا۔ اس وقت ہوا میں نمی اسی طرح تھی لیکن بارش بند ہو چکی تھی۔ کرنل ایک تنگ گلی میں سے گزر کر، جس کے دونوں جانب گھر تھے، قصبے کے چوک کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ بڑی سڑک پر پہنچا تو اسے کپکپی سی آئی۔ سڑک پر جہاں تک نظر جاتی تھی، پھولوں کا فرش بچھا تھا۔ گھروں کی دہلیزوں پر کالے کپڑوں میں ملبوس عورتیں جنازے کے گزرنے کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

جب کرنل چوک میں پہنچا تو بوندا باندی پھر شروع ہو گئی۔ بلیرڈ ہال کے مالک نے اپنے دروازے میں سے کرنل کو آتے دیکھا، اور وہیں سے بازو پھیلا کر چلّایا:

''کرنل! ٹھہرو، میں تمھیں اپنی چھتری دے دوں۔''

کرنل نے مڑے بغیر جواب دیا:

''شکریہ، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔''

جنازے کا جلوس ابھی گرجے سے باہر نہیں آیا تھا۔ مرد، سفید لباس پر کالی ٹائیاں لگائے، نیچی راہداری میں اپنی اپنی چھتریوں کے نیچے کھڑے باتوں میں مشغول تھے۔ ان میں سے ایک آدمی نے کرنل کو چوک میں پانی اور کیچڑ کے چھوٹے چھوٹے جوہڑ

پھلانگتے دیکھا۔

''ادھر چھتری کے نیچے آجاؤ، دوست!'' اس نے پکار کر کہا۔

''اس نے کرنل کے لیے چھتری کے نیچے جگہ بنائی۔

''مہربانی، دوست،'' کرنل نے کہا۔

لیکن اس نے دعوت قبول نہ کی۔ وہ سیدھا مرنے والے کے گھر میں داخل ہو گیا تا کہ اس کی ماں سے تعزیت کر سکے۔ وہاں جس چیز کا اسے سب سے پہلے احساس ہوا وہ مختلف پھولوں کی مہک تھی۔ پھر گرمی کی ایک لہر اٹھی۔ لوگوں کے درمیان میں سے راستہ بنا کر کرنل نے سونے کے کمرے کی طرف جانا چاہا۔ مگر کسی نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھا، اور اسے، لوگوں کے متعجب چہروں کے درمیان سے، کمرے کے عقبی حصے کی طرف دھکیلنے لگا، جہاں مرنے والا کھلے اور گہرے نتھنوں کے ساتھ پایا گیا تھا۔ مرنے والے کی ماں وہاں کھڑی ہوئی کھجور کے پنکھے سے لاش پر سے مکھیاں اڑا رہی تھی۔ دوسری عورتیں کالے کپڑے پہنے لاش کو ایسی ہی محویت سے دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی دریا کے دھارے کو دیکھتا ہے۔ یک دم کمرے کے دوسری جانب سے کسی کی آواز آئی۔ کرنل ایک عورت کو ہاتھ سے پرے ہٹا کر مرنے والے کی ماں کے قریب جا پہنچا، اور اس کے پاس کھڑے ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''مجھے بہت افسوس ہے،'' وہ بولا۔

عورت نے مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس نے منھ کھول کر زور سے چیخ ماری۔ کرنل لرز اٹھا۔ اسے لگا کہ تھرتھراتی آواز میں آہ وزاری کرتا ہوا بے ہیئت ہجوم

اسے لاش کی جانب دھکیل رہا ہے۔ اس نے کسی مضبوط چیز کا سہارا لینے کی کوشش کی مگر اس کے نزدیک کہیں کوئی دیوار نہ تھی۔ ہر طرف لوگ ہی لوگ تھے۔ کسی نے اس کے کان میں آہستہ سے سرگوشی کی، ''کرنل، احتیاط سے۔'' کرنل نے سر گھمایا، اور اپنے سامنے مرنے والے کو پایا۔ لیکن کرنل نے اسے نہیں پہچانا کیونکہ وہ سفید کپڑوں میں ملفوف، بگل ہاتھ میں لیے، اکڑا ہوا اور متحرک تھا، اور کرنل ہی کی طرح گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ جب کرنل نے تازہ ہوا میں سانس لینے کی خاطر اپنا چہرہ اوپر کیا تو اس نے دیکھا کہ بند تابوت سیڑھیوں سے پھسلتا، پھولوں کو کچلتا ہوا نیچے آ رہا ہے۔ اسے پسینہ آ گیا۔ اس کے جوڑوں میں درد ہونے لگا۔ ایک لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ باہر گلی میں کھڑا ہے، کیونکہ بارش کے قطرے پلکوں پر گرنے سے اسے تکلیف محسوس ہوئی۔ کسی نے اسے بازو سے پکڑ لیا، اور کہا:

''جلدی کرو دوست، میں تمھارا انتظار کر رہا تھا۔''

یہ ساباس تھا، اس کے مرحوم بیٹے کا دینی باپ، اور پارٹی کا واحد رہنما جو سیاسی مکافات سے بچ نکلا تھا اور قصبے ہی میں مقیم تھا۔ ''شکریہ، دوست،'' کہہ کر کرنل اس کی چھتری کے نیچے آ گیا اور خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بینڈ ماتمی دھن بجانے لگا۔ کرنل نے بینڈ میں بگل بجانے والے کو موجود نہ پایا، اور اسے پہلی بار مکمل طور پر یقین ہوا کہ مرنے والا واقعی مر چکا ہے۔

''بے چارہ!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

ساباس نے اپنا گلا صاف کیا۔ وہ چھتری کو بائیں ہاتھ میں یوں تھامے ہوئے تھا

کہ چھتری کا دستہ اس کے سر کے برابر پہنچ رہا تھا، کیونکہ اس کا قد کرنل سے چھوٹا تھا۔ جب جنازہ چوک سے باہر آیا تو وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔ تب ساباس کرنل کی طرف مڑا، اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے، اس نے کرنل سے پوچھا:

''دوست، مرغ کی کیا خبر ہے؟''

''ابھی تک موجود ہے،'' کرنل نے جواب دیا۔

عین اس وقت کسی کے زور سے بولنے کی آواز سنائی دی۔

''یہ لوگ جنازے کو کہاں لے جا رہے ہیں؟''

کرنل کے نظریں اوپر اٹھائیں۔ اسے بیرک کی بالکنی پر قصبے کا میئر پھیل کر کھڑا نظر آیا۔ وہ اپنے فلالین کے لمبے زیر جامے میں ملبوس تھا، اس کا ایک گال سوجا ہوا تھا اور اس نے اس گال کی حجامت نہیں بنوائی تھی۔ ایک لمحے بعد کرنل کو فادر انجل کی چیخ کر میئر سے بات کرنے کی آواز سنائی دی۔ چھتری پر بارش کی ٹپاٹپ کے باوجود کرنل نے گفتگو کی غایت سمجھ لی۔

''کیا ہے؟'' ساباس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں،'' کرنل نے جواب دیا۔ ''جنازے کو پولیس کی بیرکوں کے سامنے سے گزرنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''ہاں، میں بھول گیا تھا،'' ساباس بولا۔ ''میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں کہ مارشل لا لگا ہوا ہے۔''

''وہ تو ہے۔ لیکن یہ کون سا باغیوں کا جلوس ہے؟ ایک بے چارے غریب

موسیقار کا جنازہ ہی تو ہے۔''

جلوس نے راستہ تبدیل کر لیا۔ غریب محلوں میں عورتیں جنازے کو گزرتے خاموشی سے دیکھتی رہیں اور دانتوں سے اپنے ناخن کترتی رہیں، مگر تھوڑی دیر بعد وہ سڑک کے درمیان میں آ گئیں اور تحسین، تشکر اور الوداع کے نعرے لگانے لگیں، جیسے ان کے خیال میں مرنے والا تابوت کے اندر ان کی بات سن رہا ہو۔ قبرستان میں پہنچ کر کرنل نے خود کو بیمار محسوس کیا۔ جب ساباس نے اسے دیوار کی طرف دھکیل کر تابوت برداروں کے لیے راستہ بنایا تو اس نے مسکرا کر کرنل کی طرف دیکھا، لیکن اس کے چہرے پر ایک جامد تاثر تھا۔

''کیا بات ہے دوست؟'' ساباس نے پوچھا۔

کرنل نے آہ بھری۔

''وہی اکتوبر کی مصیبت۔''

وہ اسی سڑک سے واپس آئے جس سے قبرستان گئے تھے۔ مطلع اب صاف ہو چکا تھا۔ آسمان کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ اب شاید بارش نہیں ہو گی، کرنل نے سوچا، اور اس کی طبیعت جیسے بحال ہو گئی۔ لیکن وہ اب تک افسردہ تھا۔ ساباس کی بات نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا:

''ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے؟''

''میں بیمار نہیں ہوں،'' کرنل نے کہا۔ ''صرف اکتوبر میں ایسا لگتا ہے جیسے میری انتڑیوں میں جاندار پل رہے ہوں۔''

"آہ!" سا باس کے منھ سے نکلا۔ اس نے کرنل کو اپنے گھر کے دروازے پر خدا حافظ کہا۔ اس کا مکان نیا اور دو منزلہ تھا، جس کی کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں نصب تھیں۔ کرنل اپنے سوٹ سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خاطر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن نکڑ کی دکان سے کافی کا ڈبہ اور مرغ کے لیے آدھ پونڈ مکئی خریدنے کے لیے اسے ایک بار پھر گھر سے نکلنا پڑا۔

جمعرات کے روز وہ عموماً اپنے جھولنے میں لیٹا رہتا تھا، لیکن اس جمعرات کو وہ سارا دن مرغ کی تواضع میں لگا رہا۔ بارش کئی دن سے ہو رہی تھی۔ پورے ہفتے اس کی انتڑیوں میں نباتات اگتی رہی تھیں۔ اس کی کئی راتیں بیوی کے دمے کی سیٹیوں کے باعث بے خوابی میں گزری تھیں، لیکن جمعے کی سہ پہر کو اکتوبر نے اپنی معرکہ آرائی سے توقف کر لیا تھا۔ آگستین کے ساتھی جو اُس کے ساتھ درزی کی دکان پر کام کرتے رہے تھے اور مرغوں کی لڑائی کے رسیا تھے، موقعے سے فائدہ اٹھا کر مرغ کا معائنہ کرنے چلے آئے۔ وہ اچھی حالت میں تھا۔

لڑکوں کے رخصت ہونے کے بعد جب کرنل اکیلا رہ گیا تو خوابگاہ میں لوٹ آیا۔ اس کے بیوی کی طبیعت بھی آج قدرے بہتر تھی۔

"لڑکے کیا کہہ رہے تھے؟" اس نے پوچھا۔

"بہت جوش و خروش دکھا رہے تھے،" کرنل نے اسے اطلاع دی۔ "سب کے سب مرغ پر لگانے کے لیے پیسے بچا رہے ہیں۔"

"خدا جانے اس بدصورت مرغ میں سب کو کیا نظر آتا ہے!" عورت بولی۔

''مجھے تو وہ عجیب الخلقت لگتا ہے، اس کا سر ٹانگوں کے لحاظ سے کتنا چھوٹا ہے۔''

''سب کہتے ہیں کہ ایسا مرغ سارے علاقے میں نہیں ہے،'' کرنل نے جواب دیا۔ ''کم از کم پچاس پیسو کے برابر قیمت ہے اس کی!''

کرنل کو یقین تھا کہ اس دلیل میں اس کے مرغ کی دیکھ بھال جاری رکھنے کے عزم کا مکمل جواز موجود ہے۔ مرغ ایک لحاظ سے ان کے بیٹے کی وراثت تھا، آگستین کو مرغوں کی لڑائی کے دن ہی، آج سے نو ماہ قبل، ممنوعہ لٹریچر بانٹتے ہوئے گولی ماردی گئی تھی۔ ''یہ ایک مہنگی خام خیالی ہے،'' عورت نے کہا۔ ''مکئی ختم ہونے کے بعد ہم اسے اپنا کلیجہ ہی کھلا کر پال سکیں گے۔'' الماری میں اپنے کپڑے ڈھونڈنے کے دوران کرنل نے سوچنے کے لیے کافی وقت لیا۔

''چند مہینوں کی بات ہے،'' اس نے جواب دیا۔ ''جنوری میں مرغوں کی لڑائی ہے۔ اس کے بعد ہم اسے زیادہ قیمت پر فروخت کر سکیں گے۔''

کرنل نے جو پتلون صندوق سے نکالی اسے استری کی ضرورت تھی۔ عورت نے پتلون کو چولھے کے اوپر پھیلا دیا، جہاں دو استریاں دہکتے ہوئے کوئلوں پر گرم ہو رہی تھیں۔

''باہر جانے کی کیا جلدی ہے تمھیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ڈاک کا دن ہے۔''

''ہاں، میں تو بھول ہی گئی تھی کہ آج جمعہ ہے،'' اس نے سونے کے کمرے میں واپس جاتے ہوئے تبصرہ کیا۔ کرنل نے پتلون کے سوا باقی سب کپڑے پہن لیے تھے۔

اس کی بیوی نے اس کے جوتوں کی طرف دیکھا۔

''یہ تو اب پھینکنے کے لائق ہیں،'' وہ بولی۔ ''بہتر ہے کہ وہی نقلی چمڑے کے جوتے پہنے رہو۔''

کرنل کو سخت ناامیدی ہوئی۔

''وہ تو کسی یتیم کے جوتے دکھائی دیتے ہیں،'' اس نے احتجاج کیا۔ ''میں جب بھی انھیں پہنتا ہوں، کسی پاگل خانے سے بھاگا ہوا لگتا ہوں۔''

''ہم اپنے بیٹے کے یتیم ہی تو ہیں،'' عورت نے کہا۔

اس بار بھی اس نے کرنل کو قائل کرلیا۔ لانچوں کی سیٹیاں بجانے سے قبل ہی کرنل بندرگاہ تک پیدل پہنچ گیا۔ وہ نقلی چمڑے کے جوتوں، بغیر پیٹی کی تنگ موہری والی سفید پتلون اور بغیر کالر کی قمیص میں ملبوس تھا جو گردن پر تانبے کے بٹن سے بند کی گئی تھی۔ موسیٰ شامی کی دکان پر سے وہ لانچوں کو یکے بعد دیگرے ساحل تک آتے دیکھتا رہا۔ آٹھ گھنٹوں کی بے حرکتی سے اکڑے ہوئے مسافر اترے۔ اترنے والے وہی تھے جو ہمیشہ اترا کرتے تھے: یعنی گھر گھر جاکر چیزیں بیچنے والے اور وہ لوگ جو پچھلے جمعے کو قصبے سے گئے تھے اور اب واپس آرہے تھے۔

آخری لانچ ڈاک والی لانچ تھی۔ کرنل نے اذیت ناک بے چینی سے اسے کھاڑی پر لگتے دیکھا۔ اسے لانچ کی چھت پر چمنی سے بندھا ہوا، روغنی کپڑے میں لپٹا ڈاک کا تھیلا دکھائی دیا۔ پندرہ برس کے انتظار نے اس کے وجدان کو تیز کر دیا تھا۔ مرغ نے اس کی بے چینی میں اضافہ کر دیا تھا۔ جب پوسٹ ماسٹر لانچ پر گیا، اور تھیلے کو کھول کر

اپنے کندھے پر رکھا، کرنل اس پر مستقل نظریں جمائے رہا۔

پھر وہ بندرگاہ کے متوازی سڑک پر، جو دکانوں اور اسٹالوں کی ایک بھول بھلیاں تھی جن میں رنگ برنگی چیزیں سجی ہوئی تھیں، پوسٹ ماسٹر کے پیچھے چلنے لگا۔ ہر بار اس مرحلے سے گزرتے ہوئے اسے خوف سے مختلف، مگر اتنی ہی جابرانہ، بے چینی کا احساس ہوتا تھا۔ ڈاکٹر ڈاک خانے میں اپنے اخباروں کا منتظر تھا۔

''میری بیوی نے کہا ہے کہ میں تم سے دریافت کروں کہ کیا ہم نے، جب تم ہمارے مہمان تھے، تمھارے سر پر کھولتا ہوا پانی پھینکا تھا؟'' کرنل نے کہا۔

ڈاکٹر جوان آدمی تھا اور اس کا سر کالے اور چمکدار بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے دانتوں کی ہمواری میں کوئی ناقابلِ یقین بات تھی۔ اس نے کرنل سے دمے کی مریضہ کا حال پوچھا۔ کرنل نے اپنی بیوی کے دمے کی مکمل رپورٹ دی لیکن اس دوران پوسٹ ماسٹر پر مستقل نظریں جمائے رہا جو تھیلے میں سے خط نکال کر لکڑی کے چوکور ڈبوں میں رکھ رہا تھا۔ اس کی آہستہ روی سے کرنل برانگیختہ ہوتا رہا۔

ڈاکٹر نے اپنے خط اور اخبار وصول کیے۔ دواؤں کے اشتہار اس نے ایک جانب رکھ دیے۔ پھر وہ اپنے ذاتی خطوط دیکھنے لگا۔ اس عرصے میں پوسٹ ماسٹر اُن لوگوں میں جو ڈاک خانے میں موجود تھے، ڈاک بانٹتا رہا۔ کرنل نے اس لفافے کو دیکھا جس پر اس کے نام کا پہلا حرف درج تھا۔ اس میں نیلے کناروں والا ہوائی ڈاک کا ایک لفافہ پڑا تھا جسے دیکھ کر کرنل کے اعصابی تناؤ میں اضافہ ہونے لگا۔

ڈاکٹر نے اخباروں کے بنڈل پر لگی مہر کو توڑا۔ وہ اخبار کی سرخیاں پڑھنے لگا،

جبکہ کرنل، اپنے نام والے خانے پر نظریں جمائے، پوسٹ ماسٹر کے اس خانے کے آگے رکنے کا منتظر رہا۔ مگر پوسٹ ماسٹر اس کے پاس سے گزر کر آگے نکل گیا۔ ڈاکٹر نے اخبار کا مطالعہ روک کر کرنل کو، اور پھر پوسٹ ماسٹر کو دیکھا جو اب ٹیلیگراف کے آلے کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔ اس نے پھر کرنل کو دیکھا۔

''ہم جا رہے ہیں،'' وہ بولا۔

پوسٹ ماسٹر نے سر اٹھائے بغیر کہا:

''کرنل کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

کرنل کو خفت کا احساس ہوا۔

''مجھے ڈاک کی توقع بھی نہیں تھی،'' اس نے جھوٹ بولا۔ پھر ڈاکٹر کی طرف مڑ کر وہ بالکل بچوں کے سے لہجے میں بولا، ''مجھے کوئی خط نہیں لکھتا۔''

وہ دونوں خاموشی سے لوٹ گئے۔ ڈاکٹر کی توجہ ابھی اخبار ہی پر تھی۔ کرنل اپنے مخصوص انداز میں چل رہا تھا، کسی ایسے شخص کے انداز میں جو زمین پر کھویا ہوا سکہ ڈھونڈنے کے لیے اپنے راستے پر واپس آ رہا ہو۔ یہ ایک دھوپ بھری روشن سہ پہر تھی۔ چوک میں بادام کے درختوں سے آخری گلے سڑے پتے گر رہے تھے۔ جب وہ دونوں ڈاکٹر کے دفتر کے دروازے پر پہنچے تو اندھیرا چھانے لگا تھا۔

''خبروں میں کیا ہے؟'' کرنل نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے اس کے ہاتھ میں چند اخبار تھما دیے۔

''کوئی نہیں جانتا،'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''جو خبریں سنسر کی زد سے بچ جاتی

ہیں، ان کے بین السطور پڑھنے سے بھی کچھ پتا نہیں چلتا۔"

کرنل نے اخبار کی سرخیاں پڑھیں جو سب بین الاقوامی خبروں کی تھیں۔ اوپر چار کالم میں نہر سویز پر رپورٹ تھی۔ پہلا صفحہ تقریباً سارے کا سارا مرگ اور جنازوں کے اشتہاری اعلانات سے بھرا ہوا تھا۔

"الیکشن ہونے تو ناممکن ہیں،" کرنل نے کہا۔

"کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو، کرنل،" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہماری زندگی میں تو کسی مسیحا کے پیدا ہونے کی توقع نہیں ہے۔"

کرنل نے ڈاکٹر کو اخبار واپس کرنے چاہے، مگر ڈاکٹر نے انکار کر دیا۔

"گھر لے جاؤ،" اس نے کہا۔ "پڑھ کر کل صبح واپس کر دینا۔"

سات بجے کے بعد فلم سنسر کی درجہ بندی کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئیں۔ فادر اینجل کا دستور تھا کہ گرجے کے مینار سے گھنٹیوں کے ذریعے، ڈاک سے موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق، فلموں کی اخلاقی درجہ بندی کا اعلان کیا کرتا تھا۔ اس شام کرنل کی بیوی نے بارہ گھنٹیاں سنیں۔

"سب کے لیے نامناسب،" اس نے کہا۔ "سال ہو چلا ہے، کوئی فلم ایسی نہیں آئی جسے لوگ دیکھ سکیں۔"

مچھر دانی گراتے ہوئے اس نے منھ ہی منھ میں کہا، "ساری دنیا کا اخلاق خراب ہو گیا ہے۔" کرنل نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ بستر پر لیٹنے سے پہلے اس نے مرغ کو بستر کے پائے سے باندھ دیا۔ اس نے دروازے کی کنڈی چڑھائی اور خوابگاہ

میں کیڑے ماردوا چھڑکی۔ پھر لیمپ فرش پر رکھا، اپنا جھولنا لٹکایا اور لیٹ کر اخبار پڑھنے لگا۔

اس نے سب اخبار ترتیب وار، پہلے صفحے سے آخری صفحے تک پڑھے۔ حتیٰ کہ اشتہار بھی پڑھ ڈالے۔ گیارہ بجے کرفیو کا بگل بجا۔ آدھ گھنٹے بعد کرنل نے اخبارات کا مطالعہ ختم کیا، اٹھ کر صحن کا دروازہ کھولا اور گھپ اندھیری رات میں باہر نکل کر دیوار کے ساتھ لگ کر پیشاب کیا۔ مچھر اس کا گھیراؤ کیے ہوئے تھے۔ جب وہ خوابگاہ میں واپس آیا تو اس کی بیوی جاگ رہی تھی۔

''ریٹائرڈ جنگی سپاہیوں کے بارے میں کوئی خبر تھی؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں،'' کرنل نے اپنے بستر میں دراز ہوتے ہوئے کہا۔ ''پہلے کم از کم نئے پنشن حاصل کرنے والوں کی فہرست ہی شائع کر دیا کرتے تھے۔ پانچ سال سے وہ بھی چھپنی بند ہو گئی ہے۔''

آدھی رات کے بعد بارش شروع ہو گئی۔ کرنل تھوڑی دیر تو سویا مگر پھر اپنی انتڑیوں کے خوف سے جاگ گیا۔ کمرے کی چھت کہیں سے ٹپک رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اونی کمبل میں کانوں تک لپیٹ کر اِدھر اُدھر ٹپکاؤ کے مقام کو ڈھونڈتا رہا۔ ٹھنڈے پسینے کی ایک لکیر اس کی ریڑھ کی ہڈی پر بہنے لگی۔ اسے بخار تھا۔ اسے لگا جیسے وہ جیلی کے تالاب میں چکر کھا رہا ہو۔ کوئی بولا۔ اپنے انقلابی بستر سے کرنل نے اسے جواب دیا۔

''کس سے باتیں کر رہے ہو؟'' اس کی بیوی نے پوچھا۔

''اس انگریز سے جو چیتے کا بھیس بدل کر کرنل اوریلیانو بوئندیا کے کیمپ میں آ

گیا تھا،" کرنل نے جواب دیا۔ اس نے بخار میں تپتے ہوئے، اپنے بستر میں کروٹ لی۔ "وہ ڈیوک آف مارلبرو تھا۔"

صبح تک آسمان صاف ہو گیا تھا۔ گرجے کی عبادت کی دوسری گھنٹی بجنے پر وہ جھولنے سے کود کر اتر آیا، اور ایک الجھی ہوئی حقیقی دنیا میں پاؤں جمانے لگا جسے مرغ کی بانگ اُور الجھا رہی تھی۔ اس کا سراب تک چکرا رہا تھا۔ اُسے متلی ہو رہی تھی۔ وہ صحن میں چلا گیا اور موسمِ سرما کی دھیمی سرگوشیوں اور گہری خوشبوؤں میں سے گزر کر غسل خانے کی طرف لپکا۔ جست کی چھت والے، لکڑی کے تختوں کے بنے غسل خانے کے اندر امونیا کی بو سے ہوا لطیف ہو گئی تھی۔ کرنل نے پیشاب کی نالی کا ڈھکن اٹھایا تو اس میں سے ہزاروں مکھیاں ایک تکونے بادل کی صورت میں برآمد ہوئیں۔

اس کا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ کھردرے تختوں پر اکڑوں بیٹھے ہوئے، اسے کسی خواہش میں ناکامی کا احساس ہوا۔ اس کے اعضائے ہاضمہ میں اب کند سے درد نے جگہ پالی تھی۔ "ہر اکتوبر میں یہی ہوتا ہے،" وہ بڑبڑایا۔ لیکن جب تک اس کی انتڑیوں میں اگنے والی کھمبیوں کو سکون نہ آیا، وہ پُراعتماد اور معصوم توقع کے ساتھ وہیں بیٹھا رہا۔ آخر کار مرغ کو دیکھنے کی خاطر وہ واپس خوابگاہ میں لوٹ آیا۔

"کل رات بخار سے تمھیں ہذیان ہو رہا تھا،" اس کی بیوی نے کہا۔

ہفتے بھر کے دمے کے دورے کے ختم ہوتے ہی وہ اٹھ کر کمرے کی صفائی میں مصروف ہو گئی تھی۔ کرنل نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"بخار نہیں تھا،" اس نے جھوٹ بولا۔ "مجھے دوبارہ مکڑی کے جالوں کے خواب آ

رہے تھے۔''

ہمیشہ کی طرح عورت دمے کے دورے کے اختتام پر اعصابی قوت اور جوش سے بھرپور تھی۔ پوری صبح وہ سارے مکان کو الٹ پلٹ کرتی رہی۔ گھڑی اور نوجوان لڑکی کی تصویر کے سوا اس نے ہر چیز کی جگہ تبدیل کر دی۔ وہ اتنی دبلی اور گٹھے ہوئے بدن کی تھی کہ جب اپنے کپڑے کے چپلوں اور ہر سمت سے بند کالے لباس میں چلتی تھی تو لگتا تھا جیسے اس میں دیواروں کے پار نکل جانے کی قوت ہو۔ لیکن بارہ بجے سے پہلے اس کے وجود نے، جو بستر میں چند انچ سے زیادہ جگہ نہیں گھیرتا تھا، اپنا تن وتوش اور انسانی وزن دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔ اب، بیگونیا اور فرن کے گملوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس کی موجودگی سے پورا گھر معمور معلوم ہوتا تھا۔ ''اگر آگستین کے سوگ کا برس پورا ہو گیا ہوتا تو آج میں گانا گاتی،'' اس نے ہنڈیا میں چمچ ہلاتے ہوئے کہا، جس میں منطقۂ حارہ میں اگنے والی ہر سبزی کٹی ہوئی تھی اور پک رہی تھی۔

''گانے کو جی چاہ رہا ہے تو ضرور گاؤ،'' کرنل نے کہا۔ ''یہ تمھاری تلّی کے لیے بھی مفید ہوگا۔''

دوپہر کے کھانے کے بعد ڈاکٹر آیا۔ کرنل اور اس کی بیوی باورچی خانے میں بیٹھے کافی پی رہے تھے، جب اس نے دھکیل کر گلی والا دروازہ کھولا اور آواز لگائی:

''کیا سب فوت ہو گئے ہیں؟''

کرنل اسے خوش آمدید کہنے کو اٹھا۔

''لگتا تو ایسا ہی ہے،'' بیٹھک کی طرف جاتے ہوئے اس نے ڈاکٹر کو مخاطب کر

کے کہا، ''تم نے بھی اپنی گھڑی گِدھوں سے ملا رکھی ہے۔''

عورت معائنے کے لیے تیار ہونے خوابگاہ میں چلی گئی۔ ڈاکٹر کرنل کے ساتھ بیٹھک ہی میں رہا۔ گرمی کے باوجود ڈاکٹر کے لنن کے کپڑوں میں تازگی کی مہک تھی۔ جب عورت نے اعلان کیا کہ وہ تیار ہے تو ڈاکٹر نے کرنل کو کاغذ کے تین پرچے دیے جو ایک لفافے میں بند تھے۔ ''یہ وہ خبریں ہیں جو کل اخباروں نے شائع نہیں کی تھیں،'' اس نے کہا، اور خوابگاہ میں داخل ہو گیا۔

کرنل کو اندازہ تھا۔ ان پرچوں میں ملکی حالات کا خلاصہ تھا جو خفیہ ترسیل کی خاطر میمیوگراف کیا گیا تھا — ملک کے اندرونی حصوں میں مسلح بغاوت کے بارے میں چند نئے انکشافات۔ اس نے خود کو نہایت شکست خوردہ آدمی محسوس کیا۔ دس سال تک خفیہ خبریں پڑھنے کے باوجود وہ یہ سمجھنے کے قابل نہ ہوا تھا کہ ہر نئی خبر گزشتہ خبروں سے زیادہ حیران کن ہوتی ہے۔ جب تک ڈاکٹر واپس آیا، وہ پرچے پڑھنا ختم کر چکا تھا۔

''میری یہ مریضہ تو مجھ سے بھی زیادہ صحت مند ہے،'' اس نے کہا۔ ''مجھے ایسا دمہ ہو تو سو برس تک جی سکتا ہوں۔''

کرنل پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ کہے بغیر لفافہ اسے واپس کرنا چاہا، مگر ڈاکٹر نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔

''آگے بڑھا دینا،'' اس نے کہا۔

کرنل نے لفافے کو پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ عورت خوابگاہ سے باہر آئی اور بولی، ''مجھے پتا ہے کسی روز میں بیٹھے بیٹھے مر جاؤں گی، اور تمھیں بھی ساتھ لے کر جہنم میں

جاؤں گی، ڈاکٹر!'' ڈاکٹر نے حسبِ معمول اپنی بتیسی دکھا کر خاموشی سے بات کی داد دی۔ پھر وہ کرسی گھسیٹ کر میز کے نزدیک بیٹھ گیا، اور اپنے چرمی تھیلے میں سے دواؤں کے مفت نمونوں کی بہت سی شیشیاں نکال لیں۔ عورت باورچی خانے میں چلی گئی۔

''کافی گرم کر رہی ہوں، پی کر جانا،'' اس نے وہاں سے کہا۔

''نہیں، بہت بہت شکریہ،'' ڈاکٹر بولا۔ وہ ایک کاغذ پر دواؤں کی ترکیب استعمال لکھ رہا تھا۔ ''میں تمھیں موقع نہیں دوں گا کہ مجھے زہر پلاؤ۔''

وہ باورچی خانے میں بیٹھی ہنستی رہی۔ ڈاکٹر نے لکھنا بند کیا اور بلند آواز سے اپنے لکھے کو پڑھا، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کا لکھا کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ کرنل نے غور سے ڈاکٹر کی ہدایات سننے کی کوشش کی۔ باورچی خانے سے باہر آتے ہوئے، عورت کو اس کے چہرے پر گزشتہ رات کی اذیت کے اثرات دکھائی دیے۔

''آج صبح اسے بخار تھا،'' اس نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''رات میں دو گھنٹے تک یہ خانہ جنگی کے بارے میں الٹی سیدھی ہانکتا رہا۔''

کرنل یہ سن کر چونکا۔

''نہیں، بخار نہیں تھا،'' اس نے اپنی بڑبڑاہٹ پر قابو پاتے ہوئے اصرار کیا۔ ''جس دن بیمار ہوں گا، خود ہی اپنے آپ کو کوڑے دان میں ڈال دوں گا۔''

وہ اٹھ کر خوابگاہ میں سے اخبار لانے چلا گیا۔

''تعریف کا شکریہ،'' ڈاکٹر نے کہا۔

وہ دونوں گھر سے نکل کر چوک کی طرف روانہ ہو گئے۔ آج ہوا میں خشکی تھی۔

گرمی سے سڑکوں پر بچھا تارکول پگھلنے لگا تھا۔ جب ڈاکٹر نے کرنل کو الوداع کہا تھا تو کرنل نے اس سے اس کی فیس کے بارے میں پوچھا۔

''فی الحال کچھ دینے کی ضرورت نہیں،'' اس نے کرنل کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''مرغ جیت جائے گا تو بڑا سا بل بھیج دوں گا۔''

کرنل آستین کے ساتھیوں کو خفیہ اخبار پہنچانے درزی کی دکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب سے کرنل کے اپنے رفیق اور خانہ جنگی کے شریکِ کار مارے گئے یا ملک بدر کر دیے گئے تھے اور اس کا اپنا کام جمعے کے جمعے خط کا انتظار کرنا رہ گیا تھا، درزی کی دکان ہی اس کی واحد پناہ گاہ تھی۔

سہ پہر کی گرمی کے باعث کرنل کی بیوی کی قوت بحال ہو گئی تھی۔ برآمدے میں بیگونیا کے گملوں کے پاس پھٹے پرانے کپڑوں کا صندوقچہ سامنے رکھے، وہ بغیر کسی سامان کی مدد کے، نئے لباس تیار کرنے کے ابدی معجزے میں مستغرق تھی۔ وہ پرانی قمیصوں کی آستینوں میں سے کالر، اور چھوٹی چھوٹی، گو مختلف رنگوں کی، کترنوں میں سے پیوند بنا رہی تھی۔ ایک جھینگر نے دالان میں اپنا راگ الاپنا شروع کیا۔ سورج ڈھل چکا تھا، مگر اس نے اسے بیگونیا کے پودوں کے پیچھے غروب ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ جب شام ڈھلے کرنل گھر واپس آیا تب اس نے اپنا سلائی کا شغل بند کیا۔ اپنی گردن کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس نے اپنی انگلیاں چٹخائیں اور بولی:

''میری گردن تختے کی طرح اکڑ گئی ہے۔''

''تمھاری گردن ہمیشہ سے ایسی ہی ہے،'' کرنل نے کہا، مگر جب اس نے اپنی

بیوی کے کپڑوں اور جسم پر چاروں طرف چھوٹی چھوٹی رنگ دار کترنیں دیکھیں تو اضافہ کیا، ''تم نیل کنٹھ کے گھونسلے میں سے نکلی ہو۔''

''تمھارا لباس تیار کرنے کے لیے آدھا نیل کنٹھ تو بننا ہی پڑتا ہے،'' اس نے جواب دیا۔ اس نے تین مختلف رنگوں کے کپڑوں سے تیار کی ہوئی کرنل کی قمیص اسے دکھائی: صرف قمیص کے کالر اور آستین کے لیے ایک ہی رنگ کا کپڑا استعمال کیا گیا تھا۔ ''کارنیوال میں مسخرہ بننے کے لیے تمھیں صرف اپنا کوٹ اتارنے کی ضرورت ہوگی۔''

گرجے سے چھ بجے شام کی گھنٹیاں اس کی بات میں دخل انداز ہوئیں۔ ''خداوند خدا کے فرشتے نے مریم کو خبر دی...'' اس نے بلند آواز میں دعا پڑھنی شروع کی اور خوابگاہ کی جانب چلی گئی۔ کرنل دالان میں بیٹھا بچوں سے باتیں کرتا رہا جو اسکول کی چھٹی ہونے پر مرغ کو دیکھنے پھر آ گئے تھے۔ تب اسے یاد آیا مرغ کے لیے اگلے روز کی مکئی نہیں تھی، اور وہ اپنی بیوی سے پیسے لینے اندر چلا گیا۔

''میرا خیال ہے صرف پچاس سینٹ باقی ہیں،'' وہ بولی۔

وہ پیسے گدے کے نیچے، رومال کے کونے میں باندھ کر رکھتی تھی۔ یہ آگستین کی سلائی مشین بیچ کر حاصل کی ہوئی رقم تھی۔ اسی سے وہ پچھلے نو مہینوں سے، پائی پائی کر کے، اپنی اور مرغ کی ضرورتیں پوری کر رہے تھے۔ اب بیس سینٹ کے دو اور دس سینٹ کا ایک سکہ باقی بچا تھا۔

''آدھا سیر مکئی خرید لو،'' عورت نے کہا، ''اور باقی کے پیسوں سے کل کے لیے کافی اور چار اونس پنیر لے آنا۔''

''ہاں، اور دروازے میں لٹکانے کے لیے سونے کا ہاتھی بھی لے آؤں گا،'' کرنل نے جواب دیا۔ ''بیالیس سینٹ کی تو مکئی ہی آئے گی۔''

دونوں کچھ دیر سوچتے رہے۔ ''مرغ ایک آدھ روز بھوکا بھی رہ سکتا ہے، آخر جانور ہی تو ہے،'' عورت نے بات شروع کی۔ مگر کرنل کے چہرے کی کیفیت نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ کرنل اپنی کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے بستر پر بیٹھا، سکّوں کو اپنے ہاتھوں میں کھنکھنا رہا تھا۔ ''یہ سب میں اپنے لیے نہیں کر رہا ہوں،'' وہ ایک لمحے بعد بولا۔ ''صرف اپنی بات ہوتی تو آج ہی اسے بھون کر کھا گیا ہوتا۔ پچاس پیسو کی بدہضمی بھی کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔'' وہ بات کرتے کرتے اپنی گردن پر بیٹھے ایک مچھر کو مارنے کے لیے رکا۔ پھر اس کی نگاہیں کمرے میں عورت کا تعاقب کرنے لگیں۔

''اپنے سے زیادہ مجھے ان بچوں کا خیال ہے جو پیسے جوڑ رہے ہیں۔''

عورت نے اس کی بات پر تھوڑی دیر غور کیا۔ پھر ہاتھ میں کیڑے مار دوا کا اسپرے لیے ہوئے پوری گھوم گئی۔ کرنل کو اس کا انداز کچھ غیر حقیقی سا لگا، جیسے وہ گھر کی نگہبان روحوں سے صلاح مشورہ کر رہی ہو۔ بال آخر اس نے اسپرے کو چھوٹے کارنس پر رکھ دیا، جہاں تصویریں رکھی تھیں، اور اپنی شربتی رنگ کی آنکھیں کرنل کی شربتی رنگ کی آنکھوں پر جما دیں۔

''لے آؤ مکئی،'' اس نے کہا۔ ''خدا ہی جانتا ہے ہمارا گزارہ کیسے ہوگا۔''

2

''یہ روٹیوں کی افزائش کا معجزہ ہے،'' اگلے ہفتے کے دوران ہر روز دوپہر کو میز پر کھانے کو موجود پا کر کرنل یہی دہراتا رہا۔ اپنی رفوگری اور سلائی کڑھائی کی حیرت انگیز صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ، شاید اس کی بیوی نے پیسے کی مدد کے بغیر گھر چلانے کا گُر بھی دریافت کر لیا تھا۔ کرنل کے ساتھ اکتوبر کی عارضی صلح ابھی جاری تھی۔ ہوا میں نمی کی جگہ غنودگی نے لے لی تھی۔ تانبئی دھوپ کی آسودگی میں عورت نے تین سہ پہریں اپنے بالوں کی آرائش کے پیچیدہ عمل میں صرف کیں۔ ''بڑی عبادت شروع ہو چکی ہے،'' کرنل نے اسے ٹوٹے کنگروں والی کنگھی سے اپنے لمبے نیلگوں بالوں کی گرہیں سلجھاتے دیکھ کر کہا۔ دوسرے روز وہ دالان میں بیٹھی، گود میں سفید چادر بچھائے، باریک کنگھی سے جوئیں نکالنے میں مگن رہی، جو اس کی بیماری کے دنوں میں چوگنی ہو گئی تھیں۔ آخر کار اس نے سنبل کے عرق سے اپنے بال دھوئے اور ان کے سوکھنے کے انتظار میں انھیں دو دفعہ گول کر کے تولیے کے ساتھ گردن کے اوپر باندھے رکھا۔ کرنل انتظار کرتا رہا۔ رات کو اپنے جھولنے میں بے خواب لیٹا وہ مرغ کے بارے میں فکرمند رہا۔ لیکن بدھ کے روز جب مرغ کا وزن کیا گیا تو وہ ٹھیک ٹھاک نکلا۔

اسی سہ پہر کو جب آگستین کے ساتھی، مرغ کی فتح سے ہونے والے اپنے

مفروضہ منافعوں کا حساب لگاتے ہوئے، اس کے گھر سے رخصت ہوئے تو کرنل بھی خود کو چاق وچوبند محسوس کر رہا تھا۔ اس کی بیوی نے اس کے بال تراشے۔ ”تم نے میری عمر کے بیس سال کم کر دیے ہیں،“ کرنل نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اس کی بیوی کو لگا کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔

”جب میری صحت ٹھیک ہو تو میں مُردوں کو بھی زندہ کر سکتی ہوں،“ اس نے کہا۔

لیکن اس کی خود اعتمادی صرف چند گھنٹے قائم رہ سکی۔ گھر میں اب دیوار گھڑی اور تصویر کے سوا بیچنے کو کچھ نہ بچا تھا۔ جمعرات کی شام تک، جب وہ اپنے وسائل کی آخری حد کو پہنچ چکے تھے، عورت نے صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا۔

”فکر مت کرو،“ کرنل نے اسے تسلی دی۔ ”کل ڈاک کا دن ہے۔“

دوسرے روز وہ ڈاکٹر کے دفتر کے سامنے کھڑا لانچوں کا انتظار کر رہا تھا۔

”ہوائی جہاز کمال شے ہے،“ کرنل ڈاک کے تھیلے پر نظریں جمائے جمائے بولا۔ ”سنا ہے ایک ہی رات میں آدمی یورپ پہنچ سکتا ہے؟“

”درست ہے،“ ڈاکٹر نے ایک باتصویر رسالے سے اپنے آپ کو پنکھا جھلتے ہوئے کہا۔ کرنل نے ان بہت سے لوگوں کے درمیان پوسٹ ماسٹر کو ڈھونڈ لیا جو لانچ کے گودی پر لگنے کے منتظر تھے تاکہ اس کے لگتے ہی کود کر چڑھ جائیں۔ لانچ پر چڑھنے والا سب سے پہلا شخص پوسٹ ماسٹر تھا۔ اس نے لانچ کے کپتان سے ایک مہر لگا لفافہ وصول کیا۔ پھر وہ لانچ کی چھت پر پہنچ گیا۔ ڈاک کا تھیلا تیل کے دو کنستروں کے درمیان بندھا ہوا تھا۔

''مگر ہوائی سفر میں خطرہ تو ضرور ہوتا ہوگا،'' کرنل نے کہا۔ کچھ دیر کو پوسٹ ماسٹر اس کی نظروں سے اوجھل ہوا، لیکن جلد ہی وہ اسے شربت والے ریڑھے پر سجی ہوئی رنگ برنگی بوتلوں کے درمیان کھڑا نظر آ گیا۔ ''انسانیت کو ترقی کی کچھ قیمت تو ادا کرنی ہی پڑتی ہے۔''

''حالانکہ ہوائی سفر نئی ایجاد ہے مگر لانچوں کے مقابلے میں اب بھی محفوظ ہے،'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''آدمی بیس ہزار فٹ کی بلندی پر سفر کر رہا ہو تو موسم کے اثرات سے اوپر ہوتا ہے۔''

''بیس ہزار فٹ؟'' کرنل نے پریشان ہو کر دہرایا۔ اس کا ذہن اس ہندسے کے معنی سے ناآشنا تھا۔

ڈاکٹر کو دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس نے باتصویر رسالے کو پھیلا کر اپنے دونوں ہاتھوں پر ٹکایا۔ ''یہ مکمل سکوت اور توازن ہے،'' اس نے کہا۔

لیکن کرنل کی توجہ پوسٹ ماسٹر پر مرکوز تھی۔ اس نے اسے بائیں ہاتھ میں گلاس تھامے گلابی رنگ کا شربت پیتے دیکھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ڈاک کا تھیلا تھا۔

''مزید یہ کہ رات کو پرواز کرنے والے جہاز سمندر میں لنگر ڈالے ہوئے ہر جہاز سے رابطہ قائم رکھتے ہیں،'' ڈاکٹر بولتا رہا۔ ''ان احتیاطی تدابیر کی وجہ سے ہوائی جہاز لانچ سے کہیں زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔''

کرنل نے اس کی طرف دیکھا۔

''ظاہر ہے،'' وہ بولا، ''جہاز کا سفر یقیناً اڑنے والے قالین پر سفر کی طرح ہوتا ہوگا۔''

پوسٹ ماسٹر سیدھا ان کی طرف آیا۔ کرنل بے تابی سے ایک قدم پیچھے ہٹا، اور مہر لگے لفافے پر لکھا ہوا نام پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پوسٹ ماسٹر نے ڈاک کا تھیلا کھولا۔ اس نے اخباروں کا پلندا نکال کر ڈاکٹر کے حوالے کیا۔ پھر اس نے لوگوں کے ذاتی خطوط والا پیکٹ کھولا اور رسید کی صحت جانچنے کے بعد خطوں پر لکھے نام بلند آواز میں پکارنے شروع کیے۔ ڈاکٹر نے اخباروں کا پلندا کھولا۔

''سویز میں جنگ ابھی جاری ہے،'' اس نے سرخیاں پڑھتے ہوے کہا۔ ''مغرب کے قدم اکھڑ رہے ہیں۔''

کرنل نے سرخیاں نہیں پڑھیں۔ وہ اپنی انتڑیوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے میں لگا رہا۔ ''جب سے سنسر لگا ہے، اخباروں میں صرف یورپ کی خبریں آتی ہیں،'' وہ بولا۔ ''بہتر یہ ہوگا کہ یورپ کے لوگ یہاں آ جائیں اور یہاں کے لوگ یورپ میں جا بسیں۔ اس طرح ہر ایک کو معلوم ہوتا رہے گا کہ اس کے اپنے ملک میں کیا ہو رہا ہے۔''

''یورپ کے لوگوں کی نظر میں لاطینی امریکہ ایک مونچھوں والا شخص ہے جس کے ایک ہاتھ میں گٹار اور دوسرے میں پستول ہے،'' ڈاکٹر اخبار کے عقب سے ہنستے ہوے بولا۔ ''انھیں مسئلے کا کچھ پتا نہیں۔''

پوسٹ ماسٹر نے ڈاکٹر کی ڈاک اس کے حوالے کی۔ باقی خط تھیلے میں رکھے اور اسے بند کر دیا۔ ڈاکٹر نے اپنے ذاتی خط کھول کر پڑھنے سے قبل کرنل کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے پوسٹ ماسٹر سے پوچھا، ''کرنل کے لیے کچھ نہیں ہے؟''

کرنل کا دل دہل گیا۔ پوسٹ ماسٹر تھیلا اپنے کندھے پر ڈال کر پلیٹ فارم سے

اترا اور ان کی طرف رخ کیے بغیر بولا:

''کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا۔''

اپنی عادت کے برخلاف، کرنل سیدھا گھر واپس نہیں گیا۔ اس نے درزی کی دکان پر بیٹھ کر کافی پی؛ اس دوران آگستین کے ساتھی اخبار کے صفحے الٹتے رہے۔ کرنل خود کو فریب خوردہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ خالی ہاتھ اپنی بیوی کے سامنے جانے کی بجائے اگلے جمعے تک وہیں بیٹھا رہے۔ لیکن جب درزی کی دکان بند ہونے لگی تو اسے حقیقت کا سامنا کرنا ہی پڑا۔ اس کی بیوی اس کی منتظر تھی۔

''کچھ نہیں آیا؟'' اس نے دریافت کیا۔

''کچھ نہیں،'' کرنل نے جواب دیا۔

اس سے اگلے جمعے کو وہ پھر لانچوں کو دیکھنے گیا، اور ہر جمعے کی طرح خط کے بغیر لوٹ آیا۔ ''ہم نے کافی انتظار کر لیا،'' اس رات اس کی بیوی نے اس سے کہا۔ ''پندرہ سال تک کسی خط کا انتظار کرنے کے لیے بیل کا سا صبر چاہیے، جیسا تم میں ہے۔'' کرنل اخبار پڑھنے کی غرض سے اپنے جھولنے میں لیٹ گیا۔

''ہمارا نمبر 1830 ہے،'' اس نے کہا۔ ''باری آتے آتے وقت لگے گا۔''

''جب سے ہم انتظار کر رہے ہیں، لاٹری میں بھی یہ نمبر دو دفعہ نکل چکا ہے،'' اس کی بیوی نے جواب دیا۔

کرنل نے حسبِ معمول اخبار پہلے صفحے سے آخری صفحے تک، اشتہاروں سمیت پڑھا۔ لیکن آج وہ پڑھتے وقت خبروں پر دھیان دینے کے بجائے پرانے سپاہیوں کی

پنشن کے بارے میں سوچتا رہا۔ انیس برس قبل، جب کانگریس نے قانون بنایا تھا، آٹھ برس اسے اپنا دعویٰ منوانے میں لگے تھے۔ مزید چھ سال بعد اس کا نام پنشن کے حقداروں کی فہرست میں درج کیا گیا تھا۔ وہ آخری خط تھا جو اسے موصول ہوا۔

کرفیو کے بگل کے بعد کرنل نے اخبار پڑھنا بند کیا۔ جب وہ بتی بجھانے لگا تو اسے احساس ہوا کہ اس کی بیوی ابھی تک جاگ رہی ہے۔

''تمھارے پاس وہ اخبار کا تراشہ ابھی تک ہے؟''

عورت سوچنے لگی۔

''ہاں، باقی تمام کاغذات کے ساتھ ہی پڑا ہوگا،'' اس نے جواب دیا۔

وہ مچھر دانی میں سے باہر آئی اور الماری میں سے لکڑی کا صندوقچہ نکالا، جس میں خطوں کا ایک ترتیب وار بنڈل ربڑ کے فیتے سے بندھا رکھا تھا۔ بنڈل میں سے اس نے وکلا کی ایک فرم کا اشتہار ڈھونڈ نکالا جس میں سپاہیوں کی پنشن پر جلد از جلد کارروائی کرانے کا یقین دلایا گیا تھا۔

''جتنا وقت میں نے تمھیں وکیل تبدیل کرنے پر آمادہ کرنے میں لگایا ہے، اتنے عرصے میں ہم رقم وصول کر کے خرچ بھی کر چکے ہوتے،'' عورت نے اشتہار اپنے خاوند کو تھماتے ہوئے کہا۔ ''جان بوجھ کر اپنے مقدمے کو انڈین لوگوں کے مقدموں کی طرح طاق پر رکھوائے رہنے سے ہمیں کیا حاصل ہوا؟''

کرنل نے تراشے پر نظر ڈالی جو دو برس پرانا ہو چکا تھا۔ اس نے اسے اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ دیا جو دروازے کے پیچھے ٹنگی ہوئی تھی۔

''مصیبت یہ ہے کہ وکیل تبدیل کرنے میں پیسے خرچ ہوتے ہیں۔''

''بالکل بھی نہیں،'' عورت فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ''تم انھیں لکھو کہ وہ اپنی فیس جتنی بھی ہو پنشن ملنے پر اس میں سے کاٹ لیں۔ صرف اسی شرط پر وہ مقدمہ لیں گے۔''

چنانچہ ہفتے کی سہ پہر کو کرنل اپنے وکیل سے ملنے گیا۔ اس نے اسے کاہلی کے ساتھ اپنے جھولنے میں دراز پایا۔ وہ ایک عظیم الجثہ نیگرو تھا جس کے صرف اوپر کے دو دانت سلامت تھے۔ کرنل کو دیکھ کر اس نے اٹھ کر اپنی کھڑاویں پہنیں، اور پیانولا کے پیچھے والی کھڑکی کھول دی۔ پیانولا گرد آلود تھا اور اس کے مختلف خانوں میں، جہاں پہلے موسیقی کے کاغذات کے گول بنڈل ہوتے تھے، اب رجسٹروں میں چسپاں سرکاری گزٹ کے تراشے اور حساب کتاب کے بہی کھاتے بے ترتیب حالت میں رکھے ہوئے تھے۔ یوں بغیر کنجیوں کا پیانولا ڈیسک کا کام بھی دیتا تھا۔ وکیل اپنے گھومنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ملاقات کا مقصد بیان کرنے سے قبل کرنل کے چہرے پر بے اطمینانی اور گھبراہٹ کے آثار تھے۔

''میں نے تمھیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس مقدمے میں وقت لگے گا،'' کرنل کی بات ختم ہونے پر اس نے کہا۔ گرمی کے باعث وکیل کا جسم پسینے سے تر تھا۔ اس نے کرسی کو پیچھے دھکیل کر متوازن کیا اور ایک رسالے سے اپنے آپ کو پنکھا جھلنے لگا۔ ''میرے کارندے اکثر مجھے خط لکھتے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس معاملے میں بے صبری سے کام نہیں چلے گا۔''

''پندرہ سال ہو گئے ہیں،'' کرنل نے کہا۔ ''اب تو یہ مقدمہ خصی مرغ کی کہانی

کی طرح لگنے لگا ہے۔''

وکیل نے کرنل کی اطلاع کے لیے انتظامی امور کی جزئیات کی تفصیلی نقشہ کشی کی۔ کرسی اس کے کولھوں کے پھیلاؤ کے لیے ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔ ''پندرہ سال پہلے معاملہ پھر بھی آسان تھا،'' وہ بولا۔ ''اس وقت شہر کے پرانے سپاہیوں کی انجمن موجود تھی جس میں دونوں پارٹیوں کے لوگ شامل تھے۔'' اس کے پھیپھڑے کمرے کی دم گھونٹنے والی ہوا سے بھر گئے، اور اس نے اگلا فقرہ یوں ادا کیا جیسے اسے ابھی ابھی ایجاد کیا ہو:

''اتحاد میں طاقت ہوتی ہے۔''

''اس معاملے میں تو نہیں تھی،'' کرنل نے کہا۔ پہلی بار اسے اپنے اکیلے پن کا احساس ہوا۔ ''میرے تو سارے ساتھی ڈاک کا انتظار کرتے کرتے مر گئے۔''

وکیل کے چہرے کے تاثر میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔

''دراصل قانون بہت دیر میں جاری ہوا تھا،'' اس نے کہا۔ ''ہر کوئی تمھاری طرح خوش قسمت نہیں ہوتا کہ بیس سال کی عمر میں کرنل کا عہدہ حاصل کر لے۔ مزید یہ کہ پنشنوں کے لیے کوئی رقم تو مختص کی نہیں گئی تھی، اس لیے حکومت کو بجٹ میں گنجائش نکالنی پڑتی ہے۔''

یہ وہی پرانا قصہ تھا۔ کرنل کو وکیل کی گفتگو سن کر ہر بار ایک ہی طرح کی بے جان سی آزردگی کا احساس ہوتا تھا۔ ''ہم خیرات تو نہیں مانگ رہے،'' اس نے کہا۔ ''اور نہ حکومت ہم پر کوئی احسان کر رہی ہے۔ ریپبلک کو بچانے میں ہم نے اپنا ستیاناس کر لیا تھا۔''

''یہی ہوتا آیا ہے،'' وکیل نے جواب دیا۔ ''انسان کے ناشکرے پن کی کوئی حد نہیں ہے۔''

اس منطق سے بھی کرنل کی پرانی آشنائی تھی۔ نیرلاندیا کے معاہدے کے، جس کی رو سے حکومت نے دوسو انقلابی افسروں کو قانونی تحفظ اور سفرخرچ کی ضمانت دی تھی، دوسرے ہی دن لوگ اس انداز میں گفتگو کرنے لگے تھے۔ نیرلاندیا میں سیمل کے عظیم درخت کے نیچے ڈیرا ڈالے انقلابی افسروں کی ایک بٹالین نے، جو زیادہ تر اسکول سے فارغ ہوئے نوجوانوں پر مشتمل تھی، تین ماہ تک انتظار کیا تھا۔ پھر وہ اپنے اپنے وسائل سے گھر پہنچ کر وہاں انتظار کرتے رہے تھے۔ اس واقعے کے تقریباً ساٹھ سال بعد، کرنل آج بھی منتظر تھا۔

پرانے واقعات کی یادوں سے جوش میں آ کر اس نے ایک ماورائی رویہ اختیار کرلیا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنی ران پر رکھ لیا، جو اَب صرف ریشے چڑھی ہڈی رہ گئی تھی، اور بڑبڑایا:

''خیر، اب مجھے اس کا بندوبست کرنا ہے۔''

''کیسا بندوبست؟''

''میں وکیل تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔''

ایک بطخ اپنے متعدد چوزوں کے ساتھ دفتر میں گھس آئی۔ وکیل انھیں باہر نکالنے کے لیے اٹھا۔ ''جیسی تمھاری مرضی، کرنل،'' اس نے جانوروں کو باہر نکالتے ہوئے کہا۔ ''جیسے تم چاہو۔ میں اگر کرامات کرسکتا تو آج اس غلّے کی کوٹھری میں نہ رہ رہا ہوتا۔''

لکڑی کا ایک جنگلہ اٹھا کر اس نے دروازے کے آگے اڑا دیا، اور واپس آ کر اپنی کرسی میں دھنس گیا۔

''میرا بیٹا ساری زندگی کام کرتا رہا،'' کرنل بولا۔ ''میرا گھر رہن ہے۔ اس ریٹائرمنٹ کے قانون سے وکیلوں کی زندگی بھر کی پنشن کا انتظام ہو گیا ہے۔''

''غلط ہے،'' وکیل نے احتجاج کیا۔ ''مجھے اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ میرے تو مقدمے کے اخراجات بھی مشکل سے پورے ہوئے۔''

کرنل یہ سوچ کر پشیمان ہوا کہ شاید اس نے ناانصافی سے کام لیا ہے۔

''میرا بھی یہی مطلب تھا،'' اس نے اپنے بیان کی تصحیح کی۔ اس نے قمیص کی آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ ''گرمی سے میرے دماغ کے پرزے ڈھیلے ہو گئے ہیں۔''

تھوڑی دیر میں وکیل مختارنامہ ڈھونڈنے میں سارے دفتر کو تلپٹ کر چکا تھا۔ لکڑی کے کھردرے تختوں سے بنے اس چھوٹے سے کمرے میں دھوپ درمیان تک آ چکی تھی۔ چیزوں کے اوپر چاروں طرف ڈھونڈنے اور مختارنامہ نہ پانے کے بعد وکیل ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل، ہانپتا کانپتا، پیانولا کے نیچے گھس گیا اور تھوڑی دیر بعد کاغذوں کا ایک گول بنڈل نکال لایا۔

''یہ رہا تمھارا مختارنامہ!''

اس نے کرنل کے ہاتھ میں ایک کاغذ، جس پر مہر ثبت تھی، پکڑا دیا۔ ''میں اپنے کارندوں کو لکھ دوں گا کہ وہ اس مختارنامے کی نقلوں کی تنسیخ کر دیں۔'' وکیل نے اپنی بات

مکمل کی۔ کرنل نے کاغذ سے گرد جھاڑی اور اسے تہہ کر کے اپنی قمیص کی جیب میں رکھ لیا۔

''اسے خود پھاڑ دینا،'' وکیل نے کہا۔

''نہیں،'' کرنل نے جواب دیا۔ ''یہ بیس برس کی یادیں ہیں۔'' اور وہ منتظر رہا کہ وکیل باقی کاغذات بھی اس کے حوالے کر دے۔ مگر وکیل اپنے جھولنے کے پاس جا کر پسینہ پونچھنے لگا۔ وہاں سے اس نے چمچماتی روشنی میں سے کرنل کی طرف دیکھا۔

''مجھے باقی دستاویزات بھی چاہییں،'' کرنل نے کہا۔

''کون سی؟''

''میرے دعوے کے ثبوت کے کاغذ۔''

وکیل نے دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا دیے۔

''انھیں تلاش کرنا تو ناممکن ہے، کرنل۔''

کرنل یہ سن کر پریشان ہو گیا۔ ماکوندو کے علاقے میں انقلابی فوجوں کے خزانچی کی حیثیت سے اس نے خانہ جنگی کا تمام سرمایہ دو ٹرنکوں میں خچر کی پیٹھ پر لاد کر چھ دن کا صبر آزما سفر طے کیا تھا۔ وہ معاہدے پر دستخط ہونے سے آدھ گھنٹے قبل، قریب المرگ خچر کو کھینچتا ہوا نیر لاندیا کے خیمے میں پہنچا تھا۔ کرنل اوریلیانو بوئندیا نے، جو بحرِ اوقیانوس کے ساحل پر انقلابی فوجوں کا کوارٹر ماسٹر جنرل تھا، دونوں ٹرنکوں کی رسید دی تھی اور دستبرداری کے لیے تیار کی گئی فہرست میں انھیں شامل کرایا تھا۔

''ان دستاویزات کی قیمت کا تو اندازہ لگانا ہی ناممکن ہے،'' کرنل نے کہا۔ ''اور

ان میں کرنل اور ریلیانو بوئندیا کے ہاتھ کی لکھی رسید بھی ہے۔''

''درست ہے،'' وکیل نے کہا۔ ''مگر سینکڑوں ہاتھوں اور ہزاروں دفتروں سے گزر کر اب وہ کاغذات خدا جانے محکمۂ جنگ کے کس شعبے میں ہوں گے۔''

''کوئی سرکاری افسران کاغذات کی اہمیت سے بے خبر نہیں رہ سکتا،'' کرنل نے کہا۔

''لیکن پچھلے پندرہ برسوں تک کتنے سرکاری افسر تبدیل کیے جا چکے ہوں گے؟'' وکیل نے کہا۔ ''حساب لگا لو۔ اب تک سات صدر حکومت کی باگ ڈور سنبھال چکے ہیں، اور ہر صدر نے کم از کم دس دفعہ اپنی کابینہ بدلی ہے، اور ہر وزیر نے کم از کم سو دفعہ اپنے اہلکار تبدیل کیے ہیں۔''

''لیکن کوئی ان کاغذات کو گھر تو نہیں لے گیا ہوگا،'' کرنل نے کہا۔ ''ہر نئے افسر کو وہ مخصوص فائل میں نظر آئے ہوں گے۔''

وکیل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

''اور اگر اب یہ کاغذات محکمۂ جنگ سے نکال لیے گئے، تو ان کو نئے سرے سے رجسٹروں پر چڑھانے کے لیے مزید انتظار کرنا پڑے گا،'' اس نے کہا۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا،'' کرنل نے جواب دیا۔

''اس میں صدیاں لگ جائیں گی۔''

''کوئی بات نہیں۔ اگر آدمی بڑے مسائل کے حل ہونے کا انتظار کر سکتا ہے تو چھوٹے مسائل کے حل ہونے کا بھی کر سکتا ہے۔''

کرنل نے لکیروں والے کاغذوں کا پیڈ، قلم، دوات اور سیاہی چوس اٹھا کر بیٹھک کی چھوٹی میز پر رکھے۔ خوابگاہ کا دروازہ اس نے کھلا چھوڑ دیا، تاکہ اگر اپنی بیوی سے کچھ پوچھنا چاہے تو پوچھ سکے۔ وہ بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔

"آج کیا تاریخ ہے؟"

"ستائیس اکتوبر۔"

کرنل کا خط ستھرا تھا اور وہ نہایت محنت اور اہتمام سے لکھتا تھا۔ لکھتے وقت اس کا قلم والا ہاتھ سیاہی چوس کے اوپر ٹکا ہوتا تھا، اور وہ سیدھا بیٹھتا تھا تاکہ اس کے سانس کی آمدورفت یکساں رہے، جیسا کہ اسے اسکول میں سکھایا گیا تھا۔ چھوٹے سے بند کمرے میں گرمی ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ پسینے کا ایک قطرہ خط کے اوپر گرا۔ کرنل نے سیاہی چوس سے اسے خشک کرلیا۔ جو لفظ نمی سے پھیل گئے تھے، انھیں مٹانے میں کرنل نے خط پر مزید دھبے ڈال لیے۔ لیکن وہ اس بات پر چنداں پریشان نہ ہوا۔ مسخ تحریر کے نزدیک ستارے کا نشان لگا کر اس نے حاشیے پر وہی الفاظ دوبارہ لکھ دیے، اور پورے پیرے کو پڑھا۔

"میرا نام حقداروں کی فہرست پر کب چڑھا تھا؟"

عورت نے اپنی عبادت کا تسلسل توڑے بغیر جواب دیا: ”بارہ اگست انیس سو انچاس کو۔“

تھوڑی دیر بعد بارش شروع ہو گئی۔ کرنل نے بچگانہ سے انداز میں صفحے کے حاشیوں کو لمبے ٹیڑھے خطوط سے خاکہ کشی کر کے بھر دیا، جو اس نے مانورے کے پبلک اسکول ہی میں سیکھی تھی۔ اس کے بعد اس نے دوسرے صفحے کے نصف تک لکھا اور اپنے دستخط کر دیے۔

پھر اس نے اپنی بیوی کو خط پڑھ کر سنایا۔ بیوی نے ہر فقرے کی سر ہلا کر توثیق کی۔ خط پڑھنے کے بعد کرنل نے لفافہ بند کر دیا، اور لیمپ بجھا دیا۔

”کسی سے کہہ کر اسے ٹائپ کرالو۔“

”نہیں،“ کرنل نے جواب دیا۔ ”میں لوگوں کے احسان اٹھا اٹھا کر تنگ آ چکا ہوں۔“

آدھ گھنٹے تک وہ کھجور کے پتوں کی چھت پر بارش کی آواز سنتا رہا۔ قصبہ بارش کے طوفان میں غرق ہو رہا تھا۔ کرفیو کے بگل کے بعد کہیں سے چھت کے ٹپکنے کی آواز آنے لگی۔

”یہ قدم تمھیں بہت پہلے اٹھا لینا چاہیے تھا،“ عورت نے کہا۔ ”آدمی اپنے معاملات کو خود ہی نپٹائے تو ٹھیک رہتا ہے۔“

کرنل کے کان چھت کے ٹپکنے کی طرف لگے ہوئے تھے۔ ”خیر زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے مکان کے رہن کی ادائیگی کی تاریخ سے پہلے پہلے یہ معاملہ طے ہو ہی جائے۔“

''دو سال میں،'' عورت نے کہا۔

چھت کا سوراخ ڈھونڈنے کے لیے کرنل نے لیمپ روشن کیا۔ مرغ کا پانی والا ڈبہ ٹپکاؤ کے نیچے رکھ کر وہ خوابگاہ میں واپس آ گیا: خالی ڈبے میں بوندوں کے ٹپکنے کی کرخت آواز نے اس کا تعاقب کیا۔

''یہ بھی ممکن ہے کہ حکومت اپنی رقم پر سود بچانے کی خاطر مقدمے کا فیصلہ جنوری سے قبل ہی کر دے،'' وہ بولا، اور خود ہی قائل ہو گیا۔ ''تب تک آگستین کے سوگ کا برس بھی پورا ہو چکا ہوگا، اور ہم فلم دیکھنے جا سکیں گے۔''

عورت دبی دبی ہنسی ہنسنے لگی۔ ''مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ کارٹون کیسے ہوا کرتے تھے،'' اس نے کہا۔ کرنل نے مچھر دانی میں سے اسے دیکھنے کی کوشش کی۔

''آخری دفعہ تم نے کب فلم دیکھی تھی؟''

''انیس سو اکتیس میں،'' اس نے جواب دیا۔ ''مُردے کی وصیت دکھائی جا رہی تھی۔''

''اس میں کوئی لڑائی بھی تھی؟''

''پتا ہی نہیں چلا۔ بھوت لڑکی کا نیکلس چرانے والا تھا کہ طوفان آ گیا، اور فلم بند کر دی گئی۔''

بارش کی آواز نے دونوں کو رفتہ رفتہ سلا دیا۔ کرنل نے انتڑیوں میں بے چینی سی محسوس کی، لیکن وہ خوفزدہ نہ ہوا۔ ایک اور اکتوبر ختم ہونے کو تھا۔ اس نے خود کو اونی کمبل میں لپیٹ لیا، اور ایک لمحے کو دور سے اپنی بیوی کے سانسوں کی بجریلی آواز کو کسی اور

خواب کی رو پر بہتے ہوئے سنتا رہا۔

تب اس نے بات کی؛ بولتے وقت وہ پورے ہوش میں تھا۔

عورت جاگ گئی۔

''کس سے باتیں کر رہے ہو؟''

''کسی سے نہیں،'' کرنل نے کہا۔ ''میں یہ سوچ رہا تھا کہ ماکوندو کے جلسے میں جب ہم نے کرنل اور یلیانو بوئندیا سے کہا تھا کہ ہتھیار نہ ڈالے، تو ہم نے اسے غلط مشورہ نہیں دیا تھا۔ ساری تباہی اسی سے شروع ہوئی۔''

بارش پورے ہفتے ہوتی رہی۔ نومبر کی دو تاریخ کو، کرنل کی خواہش کے برعکس، عورت آگستین کی قبر پر پھول چڑھانے گئی۔ قبرستان سے واپس آتے ہی اس پر دمے کا حملہ ہو گیا۔ یہ ایک کٹھن ہفتہ تھا، اکتوبر کے ان چار ہفتوں سے بھی زیادہ کٹھن جنھیں جھیل جانے کی کرنل کو امید نہیں تھی۔ ڈاکٹر مریضہ کو دیکھنے آیا، اور کمرے سے چلاتا ہوا باہر نکلا، ''مجھے ایسا دمہ ہو تو سارے قصبے کو دفن کرنے کے بعد بھی زندہ رہوں۔'' لیکن اس نے علیحدگی میں کرنل سے بات کی، اور مریضہ کے لیے خاص خوراک تجویز کی۔

کرنل کا اپنا مرض پھر عود کر آیا۔ وہ دیر تک پاخانے میں بیٹھا زور لگاتا رہا، اسے ٹھنڈے پسینے آتے رہے اور یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ گل سڑ رہا ہو اور اس کی انتڑیوں میں اُگی زہریلی نباتات ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی ہوں۔ ''اب تو سردی آ گئی ہے،'' اس نے خود کو اطمینان دلایا۔ ''بارش رک جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اور اسے واقعی یقین آ گیا کہ جب پنشن کا خط آئے گا تو وہ اسے وصول کرنے کے لیے زندہ ہوگا۔

اس بار کرنل کو گھریلو اخراجات میں پیوند لگانے پڑے۔ اردگرد کی دکانوں سے اسے کئی مرتبہ دانت کچکچا کر ادھار مانگنا پڑا۔ ''صرف ایک ہفتے کی بات ہے،'' وہ دکانداروں سے کہتا رہا، حالانکہ اسے خود بھی یقین نہ تھا کہ یہ سچ ہے۔ ''پچھلے جمعے کو مجھے رقم مل جانی چاہیے تھی۔'' دورے کے گزر جانے کے بعد، عورت اسے غور سے دیکھنے پر دہشت زدہ رہ گئی۔

''تم تو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے ہو،'' اس نے کہا۔

''نہیں، میں اپنا خاص خیال رکھ رہا ہوں تاکہ اپنے آپ کو فروخت کر سکوں،'' کرنل نے جواب دیا۔ ''مجھے ایک کلارنیٹ فیکٹری والوں نے پہلے ہی رکھ لیا ہے۔''

لیکن حقیقت یہ تھی کہ خط کی امید نے اسے معمولی سا سہارا دے رکھا تھا۔ تھکن اور بے خوابی سے چُور، وہ اپنی اور مرغ کی ضرورتوں کی خبر گیری بیک وقت نہیں کر پا رہا تھا۔ نومبر کے دوسرے ہفتے میں اسے خیال ہوا کہ مرغ کو دو دن اُور مکئی نہ ملی تو وہ چل بسے گا۔ تب اسے یاد آیا کہ اس نے جولائی کے مہینے میں چمنی کے اندر مٹھی بھر لوبیا سنبھال کر رکھا تھا۔ لوبیے کی پھلیوں سے دانے نکال کر اس نے پیتل کے ڈبے میں ڈالے اور مرغ کے آگے رکھ دیے۔

''ادھر آؤ،'' اس کی بیوی نے اسے آواز دی۔

''ایک منٹ ٹھہرو،'' کرنل نے جواب دیا، اور لوبیا کے دانوں کے بارے میں مرغ کے ردعمل کا جائزہ لینے لگا۔ ''بھک منگوں کو انتخاب کا حق نہیں ہوتا۔''

اس نے اپنی بیوی کو بستر میں اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے پایا۔ اس کے

بیماری سے لاغر جسم میں سے دواؤں اور جڑی بوٹیوں کی بو اٹھ رہی تھی۔ اس نے ہر لفظ ٹھہر ٹھہر کر اور نپے تلے انداز میں ادا کیا:

''اس مرغ سے ابھی، فوراً، چھٹکارا حاصل کرو۔''

کرنل اس لمحے کی توقع کرتا رہا تھا۔ وہ اس کا اُس سہ پہر سے منتظر تھا جب اس کے بیٹے کو گولی ماردی گئی تھی اور اس نے مرغ کی نگہداشت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس موضوع پر سوچ بچار کا اسے خاصا وقت مل چکا تھا۔

''ابھی کیا فائدہ؟'' اس نے کہا۔ ''دو مہینوں میں مرغوں کی لڑائی ہے، اس کے بعد ہم اس کے اچھے پیسے حاصل کرسکیں گے۔''

''پیسوں کا سوال نہیں ہے،'' عورت نے کہا۔ ''آج جب لڑکے آئیں تو انھیں کہو کہ مرغ کو لے جائیں اور اس کے ساتھ جو کرنا ہو کریں۔''

''یہ آگستین کی خاطر ہے،'' کرنل نے پہلے سے سوچی ہوئی دلیل پیش کی۔ ''اس کی شکل یاد کرو جب وہ ہمیں بتانے آیا تھا کہ مرغ جیت گیا ہے۔''

دراصل کرنل کی بیوی نے اپنے بیٹے کے بارے میں سوچا تھا۔

''ان بدبخت مرغوں ہی کی وجہ سے اس کی جان گئی،'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''تین جنوری کو وہ اگر گھر میں ٹکا رہتا تو اس پر بُرا وقت کیوں آتا۔'' وہ اپنی سوکھی ہوئی شہادت کی انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کرکے بولی:

''مجھے یاد ہے جب وہ مرغ کو بغل میں دبا کر گھر سے باہر نکلا تھا، میں نے اسے کہا تھا کہ مرغوں کی لڑائیوں میں شامل ہو کر خواہ مخواہ اپنے لیے عذاب مول نہ لے، مگر اس

نے ہنس کر اور ڈانٹ کر مجھے خاموش کرا دیا تھا، اور کہا تھا کہ شام تک ہم دولت میں لوٹیں لگا رہے ہوں گے۔''

وہ نڈھال ہو کر پیچھے کو گر گئی۔ کرنل نے نرمی سے کھینچ کر اسے تکیے کے قریب کر دیا۔ اپنی جیسی شربتی رنگ کی آنکھوں پر اس کی نظر پڑی۔ ''ہلنے کی کوشش نہ کرو،'' وہ بولا، اور اسے یوں لگا جیسے اس کی بیوی کے سانس کی سیٹیاں اس کے اپنے سینے سے برآمد ہو رہی ہیں۔ عورت تھوڑی دیر کے لیے بے سدھ سی ہو گئی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ جب اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو اس کا سانس کچھ کچھ ہموار ہو گیا تھا۔

''یہ سب ہماری حالت کی وجہ سے ہے،'' وہ بولی۔ ''اپنے منھ کا نوالہ چھین کر ایک مرغ کو ڈال دینا گناہ نہیں تو اَور کیا ہے؟''

کرنل نے چادر سے اس کے ماتھے کا پسینہ خشک کیا۔

''تین مہینوں میں کوئی نہیں مرتا۔''

''اور ان مہینوں میں ہم کھائیں گے کیا؟'' عورت نے پوچھا۔

''پتا نہیں،'' کرنل نے کہا۔ ''لیکن ہمیں اگر بھوک کے ہاتھوں مرنا ہوتا تو بہت پہلے مر گئے ہوتے۔''

مرغ زندہ اور بھلا چنگا اپنے پیتل کے خالی ڈبے کے پاس موجود تھا۔ کرنل کو دیکھ کر وہ گلے سے تقریباً انسانی آواز نکالتے ہوئے خودکلامی سی کرنے لگا، اور اس نے اپنا سر پیچھے کو جھٹکا۔ کرنل سازباز کے انداز میں مسکرایا، اور بولا:

''زندہ رہنا آسان نہیں ہے، دوست۔''

کرنل باہر گلی میں نکل آیا۔ جس وقت لوگ قیلولہ کر رہے تھے، وہ بے مقصد ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ اس دوران اس نے کچھ سوچنے کی کوشش نہ کی، حتیٰ کہ اپنے آپ کو یہ باور کرانے سے بھی باز رہا کہ اس کی مشکلات کا کوئی حل نہیں ہے۔ وہ بھولی ہوئی گلیوں اور سڑکوں پر پھرتا رہا، یہاں تک کہ چل چل کر نڈھال ہو گیا۔ تب وہ گھر لوٹ آیا۔ عورت نے اس کے گھر میں داخل ہونے کی آواز سنی اور اسے اندر خوابگاہ میں بلایا۔

"کیا بات ہے؟"

عورت نے اسے دیکھے بغیر جواب دیا۔

"ہم گھڑی بیچ سکتے ہیں۔"

کرنل کو بھی یہ خیال آ چکا تھا۔ "مجھے یقین ہے، الوارو تمھیں اس کے چالیس پیسو تو ہاتھ کے ہاتھ دے دے گا،" عورت بولی۔ "یاد ہے اس نے سلائی مشین ہم سے کتنی جلدی خرید لی تھی؟" الوارو وہ درزی تھا جس کی دکان میں آگستین سلائی کا کام کیا کرتا تھا۔

"کل صبح اس سے بات کروں گا،" کرنل نے ہامی بھری۔

"کل صبح کا کیا مطلب؟ اسے ابھی اس کے پاس لے جاؤ، اسے اس کے کاؤنٹر پر رکھو، اور کہو: الوارو، میں یہ گھڑی تمھارے ہاتھ بیچنا چاہتا ہوں۔ وہ فوراً سمجھ جائے گا۔"

کرنل کو شرمندگی کا احساس ہوا۔

"اسے قصبے میں لے کر پھرنا ایسا ہی ہے جیسے آدمی حضرت عیسیٰ کے مزار کا گنبد لیے پھر رہا ہو،" اس نے احتجاج کیا۔ "رافیل ایسکالونا نے مجھے اس گھڑی کے ساتھ دیکھ لیا تو میرے بارے میں گانے ایجاد کر لے گا۔"

لیکن اس بار بھی اسے اپنی بیوی کی بات ماننا پڑی۔ عورت نے خود گھڑی دیوار سے اتاری، اخبار میں لپیٹی اور کرنل کے حوالے کی۔ ''چالیس پیسو کے بغیر گھر مت واپس آنا'' اس نے کہا۔ کرنل بنڈل کو بغل میں لیے درزی کی دکان کی سمت روانہ ہوگیا۔ اس نے آگستین کے ساتھیوں کو دکان کی دہلیز کے باہر بیٹھے ہوئے پایا۔

ان میں سے ایک نے کرنل کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ ''شکریہ'' وہ بولا ''میں جلدی میں ہوں۔'' الوارو دکان سے باہر آیا۔ دکان کے اندر ایک تار پر لِنن کا ایک گیلا ٹکڑا سکھانے کے لیے لٹکا ہوا تھا۔ وہ دبلے، بے لوچ جسم والا لڑکا تھا جس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ اس نے بھی کرنل کو بیٹھنے کو کہا۔ کرنل کے دل کو تھوڑا سا قرار آیا۔ اسٹول کو تھوڑا سا جھکا کر دروازے کے پاکھے کے ساتھ ٹیک لگا کر وہ بیٹھ گیا، اور منتظر رہا کہ الوارو کو فرصت ہو، تاکہ وہ علیحدگی میں اس سے بات کر سکے۔ یکدم اسے احساس ہوا کہ وہ بہت سارے بے تاثر چہروں کے درمیان گھرا ہوا ہے۔

''میں تمھارے کام میں مخل تو نہیں ہو رہا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

انھوں نے جواب دیا، ''نہیں۔'' ان میں سے ایک لڑکا اس کی طرف جھکا۔ اس نے دھیمی، تقریباً ناقابل سماعت آواز میں کہا:

''آگستین کا خط آیا ہے۔''

''کرنل نے سنسان سڑک پر نظر دوڑائی۔

''کیا لکھا ہے؟''

''کوئی نئی بات نہیں۔''

انھوں نے اسے خفیہ اخبار تھما دیا۔ کرنل نے اسے اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ خاموش بیٹھا، انگلیوں سے بنڈل کو کھٹکھٹا تا رہا، حتیٰ کہ ایک کارندے کی توجہ اس کی جانب مبذول ہوئی۔ مشوش ہو کر کرنل نے بنڈل سے کھیلنا بند کر دیا۔

''اس میں کیا ہے کرنل؟'' ایرنان نے پوچھا۔

کرنل نے ایرنان کی تیز عقاب کی سی آنکھوں سے آنکھیں ملانے سے گریز کیا۔

''کچھ نہیں،'' اس نے جھوٹ بولا۔ ''جیرمن کے پاس گھڑی مرمت کرانے لے جا رہا تھا۔''

''دیوانے ہوئے ہو کرنل؟'' ایرنان نے بنڈل اس کے ہاتھ سے لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے دو، میں دیکھتا ہوں۔''

لیکن کرنل نے بنڈل پکڑے رکھا۔ وہ بولا کچھ نہیں، مگر اس کے پپوٹے عنابی ہو گئے۔ باقیوں نے بھی اصرار کیا۔

''اسے دیکھ لینے دو، کرنل۔ ایرنان پرزوں مشینوں کا ماہر ہے۔''

''میں اسے خواہ مخواہ تکلیف نہیں دینا چاہتا۔''

''تکلیف کیسی؟'' ایرنان نے حجت کی۔ اس نے گھڑی اٹھالی۔ ''جیرمن تم سے دس پیسو دھروا لے گا اور گھڑی ویسی کی ویسی رہے گی۔''

گھڑی کو اٹھائے ایرنان دکان کے اندر چلا گیا۔ الوارو مشین پر سلائی میں مصروف تھا۔ دکان کے عقب میں دیوار پر ٹنگے ہوئے گٹار کے نیچے ایک لڑکی بٹن ٹانک

رہی تھی۔ گٹار کے اوپر سائن چسپاں تھا: ''سیاسی گفتگو کرنا منع ہے۔'' باہر بیٹھے کرنل کو اپنا جسم بالکل بے مصرف لگا۔ اس نے اپنے پاؤں اٹھا کر اسٹول میں لگی سلاخ پر رکھ لیے۔

''خدا تمھیں غارت کرے، کرنل۔''

وہ چونک پڑا۔ ''گالی دینے کی کیا ضرورت ہے؟'' اس نے کہا۔

الفانسو نے ناک پر اپنی عینک ٹھیک سے جمائی اور کرنل کے جوتوں کا معائنہ کرنے لگا۔

''تمھارے جوتوں کے بارے میں کہا ہے،'' وہ بولا۔ ''یہ مردود جوتے کہاں سے لے لیے تم نے؟''

''یہ بات تم گالی دیے بغیر بھی کہہ سکتے ہو،'' کرنل نے کہا، اور اپنے نقلی چمڑے کے جوتوں کے تلے دکھائے۔ ''یہ عجوبۂ روزگار جوتے چالیس سال پرانے ہیں، لیکن انھوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار گالیاں کھائی ہیں۔''

''ٹھیک ہو گیا،'' دکان کے اندر سے ایرنان نے نعرہ لگایا، اور ساتھ ہی گھڑی نے گھنٹہ بجایا۔ برابر والے گھر سے ایک عورت نے دیوار پر مکے مارے اور چلا کر کہا:

''گٹار کا پیچھا چھوڑ دو! آگستین کے سوگ کا برس ابھی پورا نہیں ہوا۔''

درزی کے کارندوں میں سے ایک نے زوردار قہقہہ لگایا۔

''یہ گھڑی ہے، گٹار نہیں۔''

ایرنان بنڈل لے کر دکان سے باہر آیا۔

''کوئی خاص بات نہیں تھی،'' اس نے کہا۔ ''اگر چاہو تو تمھارے گھر چل کر اس کی

سطح بھی برابر کر دوں؟''

کرنل نے ایرنان کی پیشکش کو قبول نہ کیا۔

''کتنے پیسے دوں؟''

''فکر مت کرو کرنل،'' ایرنان نے باقیوں کی صف میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔ ''تمھارا مرغ جنوری میں سب قرضوں کی ادائیگیاں کر دے گا۔''

کرنل کو اب وہ موقع ملا جس کی اسے تلاش تھی۔

''میں تمھارے ساتھ ایک سودا کرنا چاہتا ہوں،'' اس نے کہا۔

''کیسا سودا؟''

''میں مرغ تمھیں دے دیتا ہوں،'' کرنل نے چہروں کے نیم دائرے کو دیکھا۔ ''میں اسے تم سب کو دے دیتا ہوں۔''

ایرنان بھونچکا ہو کر کرنل کو دیکھنے لگا۔

''میری عمر اب مرغ لڑانے کی نہیں رہی،'' کرنل نے اپنی بات جاری رکھی۔ اس نے اپنی آواز میں وثوق اور سنجیدگی کا تاثر پیدا کیا۔ ''یہ بہت کڑی ذمے داری ہے۔ کئی روز سے مجھے لگ رہا ہے کہ مرغ قریب المرگ ہے۔''

''کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں، کرنل!'' الفانسو نے کہا۔ ''اس کے پر جھڑ رہے ہیں۔ اس کے پروں میں بخار ہو گیا ہو گا۔''

''اگلے مہینے تک ٹھیک ہو جائے گا،'' ایرنان نے کہا۔

''بہر حال، میں اب اس کی رکھوالی نہیں کرنا چاہتا،'' کرنل بولا۔

ایرنان نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کرنل کو دیکھا۔

''معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرو، کرنل!'' اس نے اصرار کیا۔ ''تمھارا فرض ہے کہ آگستین کے مرغ کو تم اپنے ہاتھ سے پالی میں اتارو۔''

کرنل نے اس بات پر غور کیا۔

''مجھے معلوم ہے،'' اس نے کہا۔ ''اسی لیے میں اب تک اسے رکھے ہوئے ہوں۔'' اس نے دانت بھینچے، اور سوچا کہ اس موضوع پر مزید بات کی جا سکتی ہے۔

''دقت یہ ہے کہ لڑائی میں ابھی دو مہینے باقی ہیں۔''

ایرنان اصل بات سمجھ گیا۔

''اگر صرف یہی دقت ہے تو اس کا حل تو آسانی سے مل سکتا ہے،'' اس نے کہا۔

اور اس نے اپنی ترکیب بتائی۔ اس کے ساتھیوں نے اسے قبول کر لیا۔ شام کو جب کرنل بنڈل تھامے گھر واپس آیا تو اس کی بیوی اسے دیکھ کر طیش میں آ گئی۔

''کچھ نہیں ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں،'' کرنل نے جواب دیا۔ ''لیکن اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ لڑکوں نے مرغ کی خوراک کا ذمہ لے لیا ہے۔''

4

"ٹھہرو دوست، میں تمھیں اپنی چھتری دیے دیتا ہوں۔"

ساباس نے دفتر کی دیوار میں نصب الماری کھولی۔ اندر بے ترتیب چیزوں کا انبار لگا ہوا تھا: گھڑسواری کے جوتے، رکابیں، لگامیں اور المونیم کی بالٹی میں پڑی مہمیزیں۔ اوپر کے حصے میں ایک زنانہ، اور آدھی درجن مردانہ چھتریاں لٹک رہی تھیں۔ کرنل کے ذہن میں آسمانی آفت کے بعد کسی شہر کے ملبے کا نقشہ ابھرا۔

"شکریہ دوست،" کرنل نے کھڑکی میں جھک کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "میں بارش کے تھمنے کا انتظار کروں گا۔" ساباس نے الماری کے پٹ کھلے رہنے دیے۔ وہ جا کر میز کے پاس، بجلی کے پنکھے کی ہوا کے نیچے بیٹھ گیا۔ تب اس نے دراز میں سے روئی میں لپٹی ہوئی ایک سرنج نکالی۔ کرنل بارش میں بھیگتے ہوئے بادام کے درختوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک سنسان سہ پہر تھی۔

"اس کھڑکی سے بارش مختلف لگتی ہے،" اس نے کہا، "جیسے کسی اور شہر میں ہو رہی ہو۔"

بارش ہر جگہ سے بارش ہی لگتی ہے،" ساباس نے جواب دیا۔ اس نے سرنج کو میز کے اوپر لگے شیشے پر ابلنے کو رکھ دیا۔ "یہ قصبہ ہی متعفن ہے،" اس نے اضافہ کیا۔

کرنل نے اپنے کندھے اچکائے۔ وہ چلتا ہوا دفتر کے درمیان تک آیا: کمرے کے فرش پر سبز ٹائلیں لگی تھیں اور فرنیچر کے غلاف شوخ رنگ کے تھے۔ کمرے کے عقب میں نمک کے تھیلے، شہد کے چھتے اور کاٹھیاں بے ترتیبی کے عالم میں پڑی تھیں۔ ساباس بالکل خالی نگاہوں سے کرنل کا تعاقب کر رہا تھا۔

''اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو اس قصبے کے بارے میں یوں نہ سوچتا،'' کرنل نے کہا۔

وہ بیٹھ گیا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سکون کے ساتھ میز پر جھکے شخص کو گھورنے لگا۔ ساباس چھوٹے سے قد کا، بہت موٹا آدمی تھا، اس کا گوشت پلپلا تھا اور تھل تھل کرتا تھا، اور آنکھوں سے مینڈک جیسی اداسی جھلکتی تھی۔

''کسی ڈاکٹر سے معائنہ کرا لو، دوست!'' ساباس نے کہا۔ ''جنازے کے دن کے بعد سے تم کچھ اداس لگ رہے ہو۔''

کرنل نے اپنا چہرہ اٹھایا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

ساباس سرنج کے ابلنے کا منتظر تھا۔ ''کاش میں بھی اپنے بارے میں یہ کہہ سکتا،'' اس نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ ''تم خوش قسمت آدمی ہو کیونکہ تمھارا معدہ فولاد کا ہے۔'' وہ اپنے ہاتھوں کی پشت کی بالوں بھری کھال کو دیکھنے لگا جس پر جگہ جگہ کالے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ شادی کے چھلے والی انگلیوں میں اس نے چھلے کے ساتھ ایک کالے رنگ والی انگوٹھی بھی پہن رکھی تھی۔

''ہاں وہ تو ہے،'' کرنل نے تسلیم کیا۔

دفتر اور گھر کے درمیانی دروازے میں سے سباباس نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ پھر وہ کرنل کو اپنی غذا کی تفصیلات کی پُردرد داستان سنانے لگا۔ اپنی جیب سے اس نے ایک بوتل نکالی اور اس میں سے مٹر کے دانے جتنی سفید گولی نکال کر میز پر رکھ دی۔

''ہر جگہ اسے ساتھ لیے پھرنا بہت بیزاری کا کام ہے،'' سباباس نے کہا، ''جیسے آدمی موت کو اپنی جیب میں لیے پھر رہا ہو۔''

کرنل میز کے قریب آیا اور گولی کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ سباباس نے اسے گولی چکھنے کی دعوت دی۔

''یہ کافی کو میٹھا کرنے کے لیے ہے،'' اس نے وضاحت کی۔ ''ہے تو یہ شکر، مگر شکر کے بغیر۔''

''واقعی،'' کرنل نے کہا۔ اس کے منہ میں اداس سی مٹھاس کا مزہ تھا۔ ''یہ ایسا ہی ہے جیسے آدمی گھنٹیوں کے بغیر گھنٹیوں کی آواز پیدا کر لے۔''

بیوی سے ٹیکا لگوانے کے بعد سباباس نے اپنی کہنیاں میز پر ٹکا لیں اور ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ کر بیٹھ گیا۔ کرنل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے جسم کا کیا کرے۔ سباباس کی بیوی نے پنکھے کا سوئچ نکال کر پنکھے کو تجوری کے اوپر رکھ دیا اور الماری کی طرف چل دی۔

''چھتریوں کا موت سے کچھ نہ کچھ تعلق ہوتا ہے،'' اس نے کہا۔

کرنل نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔ وہ ڈاک دیکھنے کے لیے چار بجے گھر

سے نکلا تھا، مگر بارش نے اسے ساباس کے دفتر میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے لانچوں کی سیٹی کی آواز سنائی دی، مگر بارش بدستور جاری تھی۔

''ہر ایک کا خیال ہے کہ موت ایک عورت ہے،'' ساباس کی بیوی نے بات جاری رکھی۔ وہ فربہ عورت تھی، اس کا قد اپنے خاوند کے قد سے نکلتا ہوا تھا، اور اوپر کے اونٹ پر ایک موٹا سا مستا تھا جس پر بال اُگے ہوئے تھے۔ اس کی گفتگو کے انداز سے آدمی کو بجلی کے پنکھے کی گھر گھراہٹ کا دھوکا ہوتا تھا۔ ''لیکن میں نہیں سمجھتی کہ موت عورت ہے۔'' اس نے الماری کے پٹ بند کر دیے اور کرنل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''میرے خیال میں موت ایک پنجوں والا جانور ہے۔''

''ممکن ہے،'' کرنل نے اعتراف کیا۔ ''بعض اوقات بہت عجیب و غریب باتیں ہوتی ہیں۔''

اس نے پوسٹ ماسٹر کے بارے میں سوچا جو موم جامے کا لباس پہنے لانچ پر کودنے والا ہوگا۔ کرنل کو اپنا وکیل تبدیل کیے ایک ماہ گزر چکا تھا۔ اب تک وہ جواب کا مستحق ہو گیا تھا۔ ساباس کی بیوی موت کے بارے میں باتیں کرتی رہی، حتیٰ کہ اسے اندازہ ہوا کہ کرنل کے چہرے پر غائب دماغی کا تاثر ہے۔

''دوست!'' وہ بولی، ''تم پریشان لگتے ہو۔''

کرنل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''درست ہے، دوست!'' اس نے جھوٹ بولا۔ ''میں سوچ رہا تھا کہ پانچ بج رہے ہیں اور مرغ کے ٹیکے کا اب تک انتظام نہیں ہو سکا۔''

ساباس کی بیوی حیران ہو گئی۔

''مرغ کا ٹیکا؟ جیسے وہ کوئی انسان ہو!'' وہ چلائی۔ ''سخت بے دینی کی بات ہے!''

ساباس اب اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا، اور اپنا غصے سے تمتمایا ہوا چہرہ اٹھا کر بولا:

''تم ایک منٹ کے لیے اپنا منھ بند رکھ سکتی ہو؟'' اس حکم سے ڈر کر اس کی بیوی نے واقعتاً اپنا منھ ڈھانپنے کو ہاتھ اٹھا لیا۔ ''پچھلے آدھے گھنٹے سے تم میرے دوست کا دماغ چاٹ رہی ہو۔''

''نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں،'' کرنل نے احتجاج کیا۔

ساباس کی بیوی گھر کے اندر چلی گئی اور زور سے دروازہ بند کر لیا۔ ساباس نے لیونڈر میں تر رومال سے اپنی گردن کا پسینہ پونچھا۔ کرنل اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ لمبی ٹانگوں والا ایک مرغ خالی چوک میں ایک طرف سے چلتا ہوا دوسری طرف جا رہا تھا۔

''کیا مرغ کو واقعی ٹیکے لگ رہے ہیں؟''

''ہاں،'' کرنل نے کہا۔ ''اس کی مشق اگلے ہفتے سے شروع ہو گی۔''

''پاگل پن ہے،'' ساباس نے کہا۔ ''یہ سب کچھ تمھارے بس کا روگ نہیں ہے۔''

''صحیح ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرغ کی گردن مروڑ دی جائے۔''

''تمھاری خواہ مخواہ کی ہٹ دھرمی ہے،'' ساباس نے کھڑکی کی جانب مڑتے

ہوئے کہا۔ کرنل نے اسے دھونکنی کی طرح آہ بھرتے ہوئے سنا۔ اپنے دوست کی آنکھوں پر اسے بے حد رحم آیا۔

''ابھی میں اتنا گیا گزرا نہیں ہوں،'' کرنل نے کہا۔

''ناسمجھی کی بات نہ کرو،'' ساباس نے زور دیا۔ ''اگر مرغ کو بیچ دو تو تمھارا دوہرا فائدہ ہے۔ ایک تو اس سر دردی سے نجات ملے گی، اور دوسرے نو سو پیسو جیب میں آئیں گے۔''

''نو سو پیسو؟'' کرنل چلایا۔

'''نو سو پیسو!''

کرنل نے اپنے ذہن میں نو سو پیسو کا تصور باندھا۔

''تمھارا خیال ہے کہ ایک مرغ کی خاطر لوگ اتنی دولت خرچ کرنے کو تیار ہو سکتے ہیں؟''

''خیال ہی نہیں،'' ساباس نے جواب دیا، ''مکمل یقین ہے۔''

انقلاب کا خزانہ واپس کرنے کے بعد سے کرنل کے ذہن میں آنے والی یہ سب سے بڑی رقم تھی۔ ساباس کے دفتر سے نکلتے وقت اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھا، مگر اسے یقین تھا کہ اس بار اس کی وجہ موسم نہیں۔ ڈاک گھر پہنچ کر وہ سیدھا پوسٹ ماسٹر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''مجھے ایک بہت ارجنٹ خط کی توقع ہے،'' کرنل نے کہا۔ ''ایر میل سے آیا ہو گا۔''

پوسٹ ماسٹر نے خانوں کو دیکھا۔ خطوں کے نام پتے پڑھ کر اس نے انھیں مناسب خانوں میں واپس رکھ دیا، لیکن منھ سے کچھ نہ بولا۔ اپنے ہاتھ جھاڑ کر اس نے معنی خیز نظروں سے کرنل کو دیکھا۔

''آج اس خط کو یقیناً آنا چاہیے تھا،'' کرنل نے کہا۔

پوسٹ ماسٹر نے کندھے اچکائے۔

''صرف موت ہی ایسی چیز ہے جو یقیناً آتی ہے، کرنل۔''

کرنل گھر پہنچا تو اس کی بیوی نے مکئی کے دلیے کی رکابی اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ رک رک کر، خاموشی سے کھاتا رہا۔ اس کے مقابل بیٹھی عورت کو احساس ہوا کہ کرنل کے چہرے پر کوئی تبدیلی آ چکی ہے۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں اس ملازم کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا کام پنشن کے کاغذ تیار کرنا ہے،'' کرنل نے جھوٹ بولا۔ ''اگلے پچاس برس میں ہم تو اطمینان سے چھ فٹ مٹی کے نیچے سو رہے ہوں گے، مگر وہ غریب آدمی اپنی ریٹائرمنٹ کی پنشن کے انتظار میں ہر جمعے کو ہلکان ہوتا رہے گا۔''

''یہ تو بُرا شگون ہے،'' عورت نے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی قسمت پر قناعت کرتے جا رہے ہو۔'' وہ دلیا کھاتی رہی، لیکن ایک لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کا خاوند اب تک اس سے بہت دور سوچوں میں کھویا ہوا ہے۔

''کم از کم کھانا تو اطمینان سے کھاؤ۔''

''ہاں، بہت مزے کا ہے،'' کرنل نے کہا۔ ''مکئی کہاں سے آئی تھی؟''

''مرغ سے،'' عورت نے جواب دیا۔ ''لڑکے اس کے لیے اتنی زیادہ لے آئے تھے کہ اس نے زائد مکئی میں ہمیں شریک کرلیا۔ زندگی اسی کا نام ہے۔''

''ٹھیک ہے،'' کرنل نے آہ بھری۔ ''تمام ایجادوں میں زندگی بہترین ایجاد ہے۔''

اس نے چولھے کے پائے سے بندھے مرغ کو دیکھا۔ اس بار وہ اسے پہلے سے مختلف لگا۔ عورت بھی مرغ کو دیکھ رہی تھی۔

''آج دوپہر کو مجھے بچوں کو ڈنڈے مار کر گھر سے بھگانا پڑا،'' اس نے کہا۔ ''وہ ایک بوڑھی مرغی کو مرغ سے میل کرانے لائے تھے۔''

''یہ کوئی نئی بات نہیں،'' کرنل نے کہا۔ ''کرنل اوریلیانو بوئندیا کے ساتھ بھی اُن قصبوں میں یہی ہوتا تھا۔ لوگ کمسن لڑکیوں کو اس سے میل کرانے لایا کرتے تھے۔''

وہ اس مذاق سے بہت محظوظ ہوئی۔ مرغ نے اپنے گلے سے آواز نکالی جو کمرے میں انسانی کلام کی طرح سنائی دی۔ ''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے یہ جانور ابھی باتیں کرنا شروع کردے گا،'' عورت نے کہا۔ کرنل نے دوبارہ مرغ کی جانب دیکھا۔

''سونے میں تولنے کے لائق ہے،'' اس نے کہا۔ اس نے چمچے سے دلیا کھاتے ہوئے دل ہی دل میں کچھ ہندسے جمع تفریق کیے۔ ''مجھے توقع ہے کہ یہ مرغ ہماری تین سال کی خوراک کا انتظام کردے گا۔''

''توقع سے پیٹ تو نہیں بھر سکتا،'' عورت نے کہا۔

''نہ سہی، مگر آدمی کی ہمت تو قائم رہتی ہے،'' کرنل نے جواب دیا۔ ''میرے دوست سابا اس کی حیرت انگیز گولیوں کا بھی یہی حال ہے۔''

اس رات ہندسوں کو ذہن سے نکالنے کی کشمکش میں کرنل کو ٹھیک سے نیند نہ آ سکی۔ دوسرے روز دوپہر کو عورت نے مکئی کا دلیا دو رکابیوں میں ڈالا، اور اپنے حصے کا دلیا سر جھکا کر کھانے لگی۔ کرنل کو اس کی غمناک کیفیت کا سایہ خود پر پڑتا محسوس ہوا۔

''کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں،'' عورت نے کہا۔

کرنل کو لگا کہ اب اس کی بیوی کی جھوٹ بولنے کی باری ہے۔ اس نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی، مگر اس کی کیفیت میں تبدیلی نہ آ سکی۔

''کوئی ایسی خاص بات نہیں،'' وہ بولی۔ ''میں سوچ رہی تھی کہ موسیقار کو مرے دو ماہ ہو چکے ہیں اور میں ابھی تک اس کے خاندان کے پاس تعزیت کے لیے نہیں گئی۔''

لہٰذا اس رات وہ اس کے گھر گئی۔ کرنل اسے وہاں چھوڑ کر خود لاؤڈ سپیکر سے سنائی دینے والی موسیقی کی جانب کھنچا ہوا سنیما گھر کی طرف چل دیا۔ پادری انجل اپنے دفتر کے باہر بیٹھا سنیما گھر کے دروازے پر نظر رکھے ہوئے تھا تاکہ اسے پتا چل سکے کہ بستی میں سے کون کون گھنٹے کی بارہ ضربوں کی تنبیہ کے باوجود فلم دیکھنے سے باز نہیں رہ سکا۔ روشنی کے سیلاب، کرخت موسیقی اور بچوں کے شور و غل نے اس علاقے کی فضا میں ایک باقاعدہ رکاوٹ پیدا کر دی تھی۔ ایک چھوٹے سے لڑکے نے اپنی لکڑی کی بندوق سے

کرنل کو دھمکایا۔

''مرغ کے بارے میں کیا خبر ہے، کرنل؟'' اس نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

کرنل نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

''ابھی موجود ہے۔''

سنیما گھر کے سامنے کی پوری دیوار پر چار رنگوں میں آدھی رات کی دوشیزہ کا اشتہار چسپاں تھا۔ اشتہار میں ایک عورت نے شام کا ڈھیلا ڈھالا گاؤن پہن رکھا تھا، اور اس کی ایک ٹانگ ران تک ننگی تھی۔ کرنل اس علاقے میں گھومتا پھرتا رہا حتیٰ کہ کہیں دور گرج چمک شروع ہوگئی۔ تب وہ اپنی بیوی کو لینے چلا گیا۔

اس کی بیوی مرنے والے کے گھر پر نہ تھی۔ نہ وہ اپنے گھر پر تھی۔ کرنل نے اندازہ لگایا کہ کرفیو شروع ہونے میں تھوڑا ہی وقت باقی ہوگا، مگر گھڑی بند تھی۔ بارش کے طوفان کو آہستہ آہستہ قصبے کی جانب بڑھتا محسوس کرتے ہوئے وہ انتظار کرتا رہا۔ وہ تیار ہوکر دوبارہ باہر جانے ہی والا تھا کہ اس کی بیوی گھر میں داخل ہوئی۔

وہ مرغ کو خوابگاہ میں لے گیا۔ اس کی بیوی نے اپنے کپڑے تبدیل کیے اور بیٹھک میں پانی پینے گئی۔ کرنل نے اسی وقت گھڑی کو چابی دے دی تھی اور اب کرفیو کے بگل کا منتظر تھا تاکہ وقت ملا سکے۔

''تم کہاں تھیں؟'' اس نے پوچھا۔

''یہیں کہیں،'' عورت نے جواب دیا۔ اس نے گلاس کو گھڑونچی پر رکھ دیا، اور اپنے خاوند کی طرف دیکھے بغیر خوابگاہ میں چلی گئی۔ ''کسے توقع تھی کہ بارشیں اتنی جلدی

پھر شروع ہو جائیں گی۔'' کرنل نے اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ جب کرفیو کا بگل بجا تو کرنل نے گھڑی میں گیارہ بجے کا وقت ملایا، اس کے تختے بند کیے اور کرسی کو اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی تسبیح پڑھنے میں مصروف ہے۔

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا،'' کرنل نے کہا۔

''کیا؟''

''تم کہاں تھیں؟''

''وہیں بیٹھی باتیں کر رہی تھی،'' اس نے کہا۔ ''اتنے عرصے بعد تو گھر سے باہر قدم رکھا تھا۔''

کرنل نے اپنا جھولنا لٹکایا۔ اس نے گھر کی کنڈیاں لگائیں اور کمرے میں دوا چھڑکی۔ پھر وہ لیمپ کو فرش پر رکھ کر بستر میں لیٹ گیا۔

''مجھے معلوم ہے،'' وہ اداس لہجے میں بولا۔ ''برے حالات کی بدترین بات یہ ہے کہ انسان جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔''

کرنل کی بیوی نے لمبی آہ بھری۔

''میں پادری اینجل کے پاس گئی تھی،'' اس نے کہا۔ ''اس سے اپنی شادی کی انگوٹھی کے بدلے قرض مانگنے۔''

''کیا کہا اس نے؟''

''مقدس چیزوں کا لین دین کرنا گناہ ہے۔''

مچھر دانی کے اندر سے اس نے بات جاری رکھی۔ ''دو روز ہوئے میں نے گھڑی

بیچنے کی کوشش کی تھی،'' وہ بولی۔ ''مگر کسی کو اس سے دلچسپی نہیں ہے۔ سب لوگ قسطوں پر نئے چمکتے ہندسوں اور سوئیوں والے کلاک خرید رہے ہیں۔ ان میں اندھیرے میں بھی وقت نظر آ جاتا ہے۔'' کرنل کو احساس ہوا کہ چالیس برس کی رفاقت، اور بھوک اور تکلیف میں حصے داری نے بھی اپنی بیوی کو پوری طرح سمجھنے میں اس کی مدد نہیں کی۔ اسے لگا جیسے ان کی محبت میں بھی کوئی شے سال خوردہ ہو چکی ہے۔

''تصویر خریدنے کو بھی کوئی تیار نہیں ہے،'' عورت نے کہا۔ ''ہر ایک کے پاس یہی تصویر پہلے سے موجود ہے۔ حتیٰ کہ تُرک نے بھی انکار کر دیا۔''

کرنل کو تلخی محسوس ہوئی۔

''تو اب ہر ایک کو پتا چلا گیا کہ ہم فاقے کر رہے ہیں۔''

''میں تھک گئی ہوں،'' عورت نے کہا۔ ''مردوں کو گھر داری کے مسائل کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ کئی بار مجھے پتھر ابالنے کو رکھنے پڑے ہیں تا کہ ہمسایوں کو یہ پتا نہ چل سکے کہ ہم کئی کئی دن ہانڈی چڑھائے بغیر رہتے ہیں۔''

کرنل کو یہ بات بری لگی۔

''یہ تو واقعی ذلت ہے۔''

اس کی بیوی مچھر دانی سے نکلی اور کرنل کے بستر کے پاس گئی۔ ''میں اس گھر کی ظاہر داری اور بناوٹ سے دستبردار ہو رہی ہوں،'' اس نے کہا۔ اس کی آواز غصے سے تیرہ ہونے لگی۔ ''میں قناعت اور رکھ رکھاؤ سے عاجز آ چکی ہوں۔''

کرنل نے مطلق جنبش نہ کی۔

''بیس سال تک ان رنگین پرندوں کا انتظار کرنا جن کے وعدے ہر الیکشن پر کیے جاتے ہیں،'' اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس سے ہمیں کیا ملا ہے؟ ایک مردہ بیٹے کے سوا کیا ملا ہے؟''

کرنل اس قسم کے طعنوں کا عادی تھا۔

''ہم نے اپنا فرض پورا کیا تھا۔''

''اور انھوں نے اپنا فرض پورا کیا، بیس سال تک سینیٹ سے ہر مہینے ہزار پیسو کی تنخواہ وصول کر کے،'' عورت نے جواب دیا۔ ''عزیز دوست سابا اس کا حال دیکھ لو۔ اس کا گھر دو منزلہ ہے لیکن اس کی ساری دولت رکھنے کے لیے پھر بھی ناکافی ہے۔ جب اس قصبے میں آیا تھا تو گلے میں سانپ لپیٹے دوائیں بیچا کرتا تھا۔''

''بیچارہ ذیابیطس کے ہاتھوں مر رہا ہے،'' کرنل نے کہا۔

''اور تم بھوک کے ہاتھوں مر رہے ہو،'' عورت نے کہا۔ ''اب تک تمھیں علم ہو جانا چاہیے تھا کہ اپنی شان سے تم اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے۔''

بجلی کی کڑک نے اس کا سلسلۂ کلام منقطع کیا۔ سڑک پر دھماکا ہوا اور بجلی کمرے میں داخل ہو کر بستر کے نیچے سے یوں گزری جیسے پتھر لڑھک رہے ہوں۔ کرنل کی بیوی اپنی تسبیح اٹھانے کے لیے مچھر دانی کی طرف لپکی۔

کرنل مسکرایا۔

''اپنی زبان قابو میں نہیں رکھو گی تو تمھارے ساتھ یہی ہوگا،'' اس نے کہا۔ ''میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ خدا میرے ساتھ ہے۔''

لیکن حقیقت میں وہ شدید تلخی محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے لیمپ بجھا دیا، اور اس اندھیرے میں جو بجلی کی چمک سے بار بار چاک ہو رہا تھا، گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اسے ماکوندو یاد آیا۔ نیرلاندیا کے مقام پر کیے ہوئے وعدوں کے پورا ہونے کے انتظار میں کرنل کو دس برس گزر چکے تھے۔ ایک سہ پہر نیند کی غنودگی میں اس نے ایک پیلی گرد آلود ریل گاڑی کو قصبے میں داخل ہوتے دیکھا۔ گاڑی کے ڈبوں کے اندر باہر، حتیٰ کہ چھتوں پر بھی، مرد عورتیں اور جانور لدے ہوئے تھے۔ یہ کیلوں کی فصل سے کمائی کی دیوانگی تھی۔

چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر نو واردوں نے قصبے کی کایا کلپ کر دی تھی۔ ''میں یہاں سے جا رہا ہوں،'' کرنل نے اس وقت کہا تھا۔ ''کیلوں کی بُو میری انتڑیاں چاٹ رہی ہے۔'' اور اس نے ماکوندو کو، واپسی کی گاڑی پر، بدھ 27 جون 1906 کے دن، دوپہر دو بج کر اٹھارہ منٹ پر، ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں تقریباً نصف صدی لگی کہ نیرلاندیا میں اطاعت قبول کرنے کے وقت سے لے کر اب تک اسے سکون کا ایک لمحہ بھی نصیب نہیں ہوا۔

کرنل نے آنکھیں کھولیں۔

''اب اس بارے میں زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہے،'' وہ بولا۔

''کس بارے میں؟''

''مرغ کے بارے میں،'' کرنل نے کہا۔ ''کل میں اسے سابا اس کے ہاتھ نو سو پیسو میں فروخت کر دوں گا۔''

5

خصی جانوروں کی چیخیں ساباس کی چیخ پکار میں شامل ہو کر دفتر کی کھڑکی میں سے اندر آ رہی تھیں۔ اگر ساباس اگلے دس منٹوں میں نہ آیا تو میں یہاں سے چل دوں گا، کرنل نے دو گھنٹے کے انتظار کے بعد اپنے آپ سے عہد کیا۔ لیکن اس نے مزید بیس منٹ انتظار کیا۔ وہ اٹھ کر چلنے کو تھا جب ساباس کارکنوں کے غول کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ کئی بار وہ کرنل کی طرف دیکھے بغیر اس کے سامنے آتا جاتا رہا۔

''میرا انتظار کر رہے ہو، دوست؟''

''ہاں دوست،'' کرنل نے کہا۔ ''لیکن اگر تم بہت مصروف ہو تو میں کسی اور وقت آ جاؤں گا۔''

دروازے کے عقب سے ساباس کو اس کی بات سنائی نہ دی۔

''میں ابھی آتا ہوں،'' ساباس نے کہا۔

دوپہر کی گرمی دم گھونٹے دیتی تھی۔ سڑک کی روشنی سے دفتر تمتما رہا تھا۔ گرمی کی کسالت سے کرنل نے بلا ارادہ آنکھیں بند کر لیں، اور یکدم اپنی بیوی کے بارے میں خواب دیکھنے لگا۔ ساباس کی بیوی دبے پاؤں دفتر میں داخل ہوئی۔

''جاگو مت، دوست!'' وہ بولی۔ ''میں کھڑکی کے پردے گرانے آئی تھی۔ دفتر

جہنم کی طرح تپ رہا ہے۔"

کرنل خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پردے گرانے کے بعد، ساباس کی بیوی کمرے کے اندھیرے میں بولی۔

"کیا تم اکثر خواب دیکھتے ہو؟"

"کبھی کبھی،" کرنل نے اپنے اونگھنے پر پشیمان سا ہو کر جواب دیا۔ "مجھے تقریباً ہمیشہ ایک ہی خواب آتا ہے کہ میں مکڑی کے جالوں میں پھنستا جا رہا ہوں۔"

"مجھے ہر رات ڈراؤنے خواب آتے ہیں،" ساباس کی بیوی نے کہا۔ "اب میرے دماغ میں یہی بات سمائی ہوئی ہے کہ کسی طرح خواب میں آنے والے لوگوں کے بارے میں پتا کیا جائے کہ وہ کون ہیں۔"

اس نے پنکھا چلا دیا۔ "پچھلے ہفتے میں نے ایک عورت کو دیکھا جو میرے سرہانے کھڑی تھی،" وہ بولی۔ "میں نے پوچھ ہی لیا کہ تم کون ہو۔ اس نے کہا، میں وہ عورت ہوں جو بارہ برس پہلے اسی کمرے میں فوت ہوئی تھی۔"

"لیکن اس گھر کو بنے تو مشکل سے دو برس ہوئے ہوں گے،" کرنل نے کہا۔

"درست ہے،" ساباس کی بیوی نے جواب دیا۔ "اس سے پتا چلتا ہے کہ مُردے بھی حساب میں غلطی کر جاتے ہیں۔"

پنکھے کی گھوں گھوں سے کمرے کا اندھیرا اور گہرا لگنے لگا۔ ساباس کی بیوی خوابوں سے ہٹ کر اب آواگون کے مسئلے پر اظہارِ خیال کر رہی تھی۔ اپنی غنودگی اور اس عورت کی بے تکی گفتگو سے کرنل بے چین ہونے لگا۔ وہ گفتگو میں تھوڑا سا وقفہ پڑنے کا منتظر تھا

تا کہ رخصت چاہے، کہ ساباس اپنے فورمین کے ہمراہ دفتر میں داخل ہوا۔

''میں تمھارا سوپ چار دفعہ گرم کر چکی ہوں،'' اس کی بیوی نے کہا۔

''چاہے دس دفعہ گرم کرلو،'' ساباس نے کہا، ''لیکن اس وقت میرا پیچھا چھوڑ دو۔''

ساباس نے تجوری کھول کر فورمین کو نوٹوں کی ایک گڈی اور کاغذ پر لکھی ہدایات کی فہرست تھمائی۔ فورمین نے نوٹ گننے کے لیے کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ ساباس نے دفتر کے عقبی حصے میں کرنل کو بیٹھے دیکھا، مگر کوئی تاثر ظاہر نہ کیا۔ وہ فورمین سے باتوں میں مصروف رہا۔ جس وقت ساباس اور فورمین دوبارہ دفتر سے باہر جانے والے تھے، کرنل کھڑا ہو گیا۔ دروازہ کھولنے سے قبل ساباس رکا۔

''میں تمھاری کیا خدمت کر سکتا ہوں، دوست؟''

کرنل نے دیکھا کہ فورمین اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں دوست،'' وہ بولا۔ ''میں تم سے صرف بات کرنا چاہتا تھا۔''

''جو کہنا ہے جلدی سے کہو،'' ساباس نے کہا۔ ''مجھے ایک منٹ کی فرصت نہیں ہے۔''

وہ دروازے کے دستے پر ہاتھ رکھ کر ذرا رکا۔ کرنل کو اپنی زندگی کے پانچ طویل ترین سیکنڈ گزرنے کا احساس ہوا۔ اس نے دانت بھینچ لیے۔

''مرغ کے بارے میں،'' وہ بڑبڑایا۔

اب تک ساباس دروازہ کھول چکا تھا۔ ''مرغ کے بارے میں،'' اس نے دہرایا، مسکرا کر فورمین کو ہال کی طرف دھکیلا۔ ''یہاں آسمان گرنے والا ہے اور میرے دوست

کو مرغ کی پڑی ہے۔'' اور پھر کرنل سے مخاطب ہو کر بولا:

''ٹھیک ہے دوست، میں ابھی آتا ہوں۔''

کرنل دفتر کے وسط میں ساکت کھڑا رہا یہاں تک کہ اسے دونوں آدمیوں کے پیروں کی چاپ ہال کے سرے پر پہنچ کر سنائی دینی بند ہو گئی۔ تب وہ دفتر سے باہر نکلا اور قصبے میں گشت کرنے لگا جو اتوار کے قیلولے میں مفلوج پڑا تھا۔ درزی کی دکان پر کوئی نہ تھا۔ ڈاکٹر کا دفتر بند تھا۔ شامی کی دکان کے تختوں پر پڑے مال کی حفاظت کرنے کو بھی کوئی موجود نہ تھا۔ دریا فولاد کی چادر جیسا لگ رہا تھا۔ کنارے پر ایک آدمی تیل کے چار پیپوں پر لیٹا، اپنا چہرہ ہیٹ سے ڈھانپے، سو رہا تھا۔ کرنل کو لگا جیسے سارے شہر میں وہی متحرک ہے۔ وہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

اس کی بیوی دوپہر کا باقاعدہ کھانا سامنے رکھے اس کی منتظر تھی۔

''یہ سب میں نے ادھار لیا ہے، کل پیسے دینے کا وعدہ کر کے،'' اس نے وضاحت کی۔

کھانا کھانے کے دوران کرنل نے اسے پچھلے تین گھنٹوں کا ماجرا سنایا۔ وہ بے چینی کے ساتھ اس کی بات سنتی رہی۔

''تمھارے ساتھ دقت یہ ہے کہ تم میں کردار نام کو بھی نہیں ہے،'' وہ آخرکار بولی۔ ''تم اپنے آپ کو یوں پیش کرتے ہو جیسے خیرات مانگ رہے ہو جبکہ تمھیں وہاں سر اٹھا کر جانا چاہیے تھا، اور ہمارے دوست کو ایک طرف لے جا کر اس سے صاف صاف کہنا چاہیے تھا کہ دوست، میں نے مرغ تمھارے ہاتھ بیچنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''تمھارے حساب سے تو زندگی ہوا کی طرح سبک ہے،'' کرنل نے کہا۔

عورت کے رویے سے بے حد چستی کا اظہار ہوتا تھا۔ صبح صبح اس نے گھر کو صاف کیا تھا اور اپنا حلیہ عجیب وغریب بنا رکھا تھا۔ اس نے کرنل کے پرانے جوتے پہن رکھے تھے، کمر کے گرد موم جامے کا ایپرن باندھ رکھا تھا، اور بالوں پر کپڑے کی دھجی، جس میں کانوں کے اوپر دونوں جانب گرہیں تھیں۔ ''تم میں کاروبار کی ذرا سوجھ بوجھ نہیں ہے،'' وہ بولی۔ ''کوئی چیز بیچتے وقت آدمی کے چہرے پر وہی کیفیت ہونی چاہیے جو خریدتے وقت ہوتی ہے۔''

کرنل اس کے حلیے سے خاصا محظوظ ہوا۔

''تم نے اپنی جو شکل بنا رکھی ہے اسے قائم رکھنا،'' کرنل نے مسکرا کر اس کی بات کاٹی۔ ''تم کویکر اوٹس کے ڈبے پر بنے ہوئے آدمی کی طرح لگ رہی ہو۔''

اس نے سر سے کپڑے کی دھجی اتار پھینکی۔

''میں سنجیدگی سے بات کر رہی ہوں،'' اس نے کہا۔ ''میں مرغ کو ابھی ساباس کے پاس لے جا رہی ہوں، اور تم جتنی رقم کی چاہو شرط لگا لو، آدھ گھنٹے میں نو سو پیسو کے ساتھ واپس آ جاؤں گی۔''

''تمھارا دماغ چل گیا ہے،'' کرنل نے کہا۔ ''ابھی سے تم مرغ کی رقم سے شرطیں بدنے لگی ہو۔''

بہت مشکل سے کرنل نے اسے ساباس کے ہاں جانے سے باز رکھا۔ عورت نے ساری صبح اپنے ذہن میں، ہر جمعے کی مسلسل کوفت کے بغیر، اگلے تین برس کے اخراجات کا

تخمینہ لگانے میں صرف کی تھی۔ اس نے گھر کے لیے ضرورت کی چیزوں کی فہرست بنائی تھی جس میں اس نے کرنل کے لیے جوتوں کے نئے جوڑے کو فراموش نہیں کیا تھا۔ خوابگاہ میں نیا آئینہ لٹکانے کے لیے اس نے جگہ کا انتخاب بھی کرلیا تھا۔ اپنے منصوبوں کی وقتی شکست نے اسے پشیمان اور آزردہ کر دیا۔

تھوڑی دیر کے لیے وہ جا کر سو رہی۔ جب وہ اٹھی تو کرنل آنگن میں بیٹھا تھا۔

''اب تم کیا کر رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''سوچ رہا ہوں،'' کرنل نے جواب دیا۔

''تب تو مسئلہ حل ہو گیا۔ اگلے پچاس برس تک ہم مرغ کی رقم حاصل کرنے کی توقع رکھ سکتے ہیں۔''

لیکن حقیقت میں کرنل اسی شام مرغ فروخت کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اسے ساباس کا خیال آیا، جو اس وقت دفتر میں اکیلا پنکھے کے آگے بیٹھا اپنا روز کا ٹیکا لگوانے کی تیاری کر رہا ہوگا۔ اس کا جواب تیار تھا۔

''مرغ کو ساتھ لے جاؤ'' باہر نکلتے ہوئے کرنل کی بیوی نے اسے مشورہ دیا۔ ''اسے جیتا جاگتا اپنے سامنے دیکھ کر ساباس پر حیرت انگیز اثر ہوگا۔''

کرنل کو مرغ کو اپنے ساتھ لے جانے پر اعتراض تھا۔ وہ مایوس اضطراب میں، اس کے ساتھ ساتھ دروازے تک آئی۔

''دفتر میں پوری فوج بھی موجود ہو تو گھبرانے کی ضرورت نہیں،'' اس نے کہا۔ ''تم ساباس کو بازو سے پکڑ لینا اور اس وقت تک نہ چھوڑنا جب تک وہ نو سو پیسو تمھارے

حوالے نہ کر دے۔"

"وہ سمجھیں گے کہ ہم نے ڈاکا ڈالنے کا منصوبہ بنایا ہے۔"

کرنل کی بیوی نے اس فقرے پر دھیان نہ دیا۔

"یہ یاد رکھنا کہ تم مرغ کے مالک ہو،" اس نے اصرار کیا، "اور اس پر احسان کر رہے ہو۔"

"اچھا۔"

ساباس ڈاکٹر کے ہمراہ خوابگاہ میں تھا۔ "اب موقع ہے،" اس کی بیوی نے کرنل سے کہا۔ "ڈاکٹر اسے تین چار روز کے سفر کے لیے تیار کر رہا ہے۔ ساباس اب کا گیا جمعرات کو لوٹے گا۔" کرنل دو متضاد قوتوں سے نبرد آزما تھا: مرغ کو بیچ دینے کے عزم کے باوجود وہ سوچ رہا تھا کہ اچھا ہوتا اگر وہ ایک گھنٹے دیر سے آیا ہوتا، اور اس سے ملاقات نہ کر پاتا۔

"میں انتظار کر سکتا ہوں،" وہ بولا۔

لیکن ساباس کی بیوی مصر رہی۔ وہ اسے خوابگاہ میں لے گئی، جہاں ساباس اپنے تخت جیسے بستر پر، زیر جامہ پہنے، اپنی بے رنگ آنکھیں ڈاکٹر کے چہرے پر جمائے بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر نے ساباس کے پیشاب کا نمونہ شیشے کی نالی میں گرم کیا، اس کی بو سونگھی اور اثبات میں سر ہلایا۔ کرنل اس سارے عمل کے ختم ہونے کا منتظر رہا۔

"اسے گولی مارنی پڑے گی،" ڈاکٹر نے کرنل کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ذیابیطس امیر آدمیوں کو ختم کرنے میں بہت دیر لگاتی ہے۔"

''تمھارے اِنسولین کے ملعون ٹیکوں نے خاصی کوشش کی ہے،'' ساباس نے کہا اوراپنے کولھوں کے بل تھوڑا سا اوپر اٹھا۔ ''لیکن مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔'' پھر وہ کرنل سے مخاطب ہوا:

''اندر آ جاؤ دوست۔ دوپہر کو جب میں تمھیں دیکھنے باہر نکلا تو تم کیا، تمھاری ٹوپی بھی کہیں نظر نہیں آئی۔''

''میں پہنتا ہی نہیں تا کہ ہر ایک کے سامنے سر سے اتارنی نہ پڑے۔''

ساباس کپڑے پہننے لگا۔ ڈاکٹر نے خون کے نمونے والی شیشے کی ٹیوب اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالی۔ پھر اپنے بیگ میں چیزوں کو ترتیب سے رکھا۔ کرنل نے سوچا ڈاکٹر وہاں سے رخصت ہونے والا ہے۔

''میں تمھاری جگہ ہوں تو اپنے دوست کو ایک لاکھ پیسو کا بل بھیج دوں گا، ڈاکٹر،'' کرنل نے کہا۔ ''اتنی رقم جانے سے ساباس کی پریشانی بہت حد تک کم ہو جائے گی۔''

''میں پہلے ہی اسے ایک کروڑ پیسو کا بل بھیجنے کی تجویز دے چکا ہوں،'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''غربت ذیابیطس کا بہترین علاج ہے۔''

''تجویز کا شکریہ،'' ساباس نے اپنا ضخیم پیٹ گھڑسواری کی تنگ پتلون کے اندر ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمھیں امارت کے عذاب سے بچانے کی خاطر، میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔'' ڈاکٹر کو اپنے چرمی بیگ کے چمکدار تالے کی سطح پر اپنے دانتوں کا عکس دکھائی دیا۔ بے صبری دکھائے بغیر ڈاکٹر نے کلاک کی طرف دیکھا۔ ساباس بوٹ پہنتے پہنتے اچانک کرنل کی طرف مڑا:

"تو پھر دوست، مرغ کا کیا بن رہا ہے؟"

کرنل نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر بھی اس کے جواب کا منتظر ہے۔ اس نے اپنے دانت سختی سے بھینچ لیے۔

"کچھ نہیں بن رہا، دوست" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "میں تمھارے پاس اس کا سودا کرنے آیا ہوں۔"

ساباس بوٹ پہن چکا تھا۔

"ٹھیک ہے، دوست،" اس نے کسی جذبے کے بغیر جواب دیا۔ "نہایت معقول بات ہے۔"

"میری عمر اب ان پیچیدگیوں میں پڑنے کی نہیں رہی؛" کرنل نے ڈاکٹر کے چہرے پر مبہم قسم کا تاثر دیکھ کر توجیہہ پیش کرنے کی کوشش کی۔ "میری عمر بیس سال کم ہوتی تو اور بات تھی۔"

"کرنل، تمھاری عمر ہمیشہ بیس سال کم ہی رہے گی،" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

کرنل کے حواس کچھ بحال ہوئے۔ وہ ساباس کے مزید کچھ بات کرنے کا منتظر رہا، مگر وہ کچھ نہ بولا۔ وہ اپنی چمڑے کی زپ والی جیکٹ پہن کر کمرے سے باہر جانے کو تیار ہو گیا۔

"اگر تم چاہو تو ہم اگلے ہفتے اس بارے میں بات کر سکتے ہیں،" کرنل نے کہا۔

"ہاں میں بھی یہی کہنے والا تھا؛" ساباس نے کہا۔ "ایک خریدار میری نظر میں ہے جو مرغ کے چار سو پیسو دے گا، لیکن جمعرات تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

''کتنے پیسو؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''چارسو۔''

''مجھے تو پتا چلا تھا کہ مرغ کی قیمت اس سے کہیں زیادہ ہے،'' ڈاکٹر نے کہا۔

''تم نے خود نو سو پیسو کا ذکر کیا تھا،'' کرنل نے ڈاکٹر کی حیرت سے حوصلہ پا کر کہا۔ ''وہ سارے علاقے کا بہترین مرغ ہے۔''

ساباس نے ڈاکٹر کو جواب دیا۔

''کوئی اَور وقت ہوتا تو اس کے ہزار پیسو بھی مل جاتے،'' اس نے وضاحت کی۔ ''مگر اتنے قیمتی مرغ کو کوئی نہیں لڑاتا۔ ہمیشہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ وہ پالی سے زندہ باہر نہ آ سکے گا۔'' پھر وہ بناوٹی مایوسی سے کرنل کی طرف مڑا۔

''دوست، میں تمھیں یہی بتانا چاہتا تھا۔''

کرنل نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے،'' وہ بولا۔

وہ ساباس کے پیچھے پیچھے ہال میں آ گیا۔ ڈاکٹر نشست کے کمرے میں ساباس کی بیوی سے مصروفِ گفتگو رہا جو اس سے ان کیفیتوں کا علاج دریافت کر رہی تھی جو بقول اس کے آدمی پر اچانک وارد ہو جاتی ہیں اور جن کے بارے میں آدمی کو علم نہیں ہوتا کہ وہ کیا ہیں۔ کرنل دفتر میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ ساباس نے تجوری کھولی، اپنی تمام جیبیں نوٹوں سے بھریں اور چار نوٹ کرنل کی طرف بڑھا دیے۔

''یہ لو، یہ ساٹھ پیسو ہیں دوست،'' اس نے کہا۔ ''جب مرغ بک جائے گا تو

حساب کرلیں گے۔"

کرنل ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ دریا کے کنارے پر دکانوں کے پاس سے گزرے، جن پر بعد دوپہر کی خنکی کے باعث رونق ہونی شروع ہوگئی تھی۔ گنوں سے لدا ایک بجرا پانی کے بہاؤ کے رخ آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ کرنل نے ڈاکٹر کو غیر معمولی طور پر اپنے خیالوں میں گم پایا۔

"اور تمھارا کیا حال ہے، ڈاکٹر؟" کرنل نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے اپنے کندھے اچکائے۔

"ویسا ہی جیسا پہلے تھا،" اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے مجھے بھی کسی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

"اس کی وجہ سردی ہے،" کرنل نے کہا۔ "یہ مجھے بھی اندر سے کھاتی رہتی ہے۔"

ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ دلچسپی سے عاری نظر سے کرنل کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے دکانوں پر بیٹھے شامیوں سے یکے بعد دیگرے دعا سلام کی۔ ڈاکٹر کے دفتر کے دروازے پر کرنل نے مرغ کی فروخت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"میرے پاس اَور کوئی چارہ نہیں تھا،" کرنل نے توضیح کی۔ "اس جانور کی غذا انسانی گوشت ہے۔"

"واحد جانور جس کی غذا انسانی گوشت ہے وہ ساباس ہے،" ڈاکٹر نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے وہ مرغ کو نو سو میں آگے بیچ دے گا۔"

"اچھا، تمھارا یہ خیال ہے؟"

''مجھے پکّا یقین ہے،'' ڈاکٹر بولا۔ ''یہ اتنا ہی نفع بخش سودا ہے جتنا اس کا میئر کے ساتھ حب الوطنی کا مشہور معاہدہ تھا۔''

کرنل نے ڈاکٹر کی بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ ''مگر میرے دوست نے وہ معاہدہ اپنی جان کے خوف سے کیا تھا،'' کرنل نے کہا۔ ''وہ اسی طرح اس قصبے میں رہ سکتا تھا۔''

''اور اسی طرح اپنے ساتھیوں کی جائیداد آدھی قیمت پر خرید سکتا تھا جنھیں میئر نے نکال باہر کیا تھا،'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا، کیونکہ اسے اپنی جیب میں چابیاں نہیں ملیں۔ تب اس نے کرنل کی بے یقینی کا سامنا کیا۔

''اتنے بے عقل مت بنو،'' اس نے کہا۔ ''ساباس کو اپنی جان کے مقابلے میں پیسے سے زیادہ دلچسپی ہے۔''

اس رات کرنل کی بیوی خریداری کرنے بازار گئی۔ شامیوں کی دکانوں تک وہ بھی اس کے ساتھ گیا، اور ڈاکٹر کے انکشافات پر غور کرتا رہا۔

''لڑکوں کو تلاش کر کے انھیں فوراً بتا دو کہ مرغ بک گیا ہے،'' اس نے کرنل سے کہا۔ ''انھیں خواہ مخواہ امید دلائے رکھنے سے کیا فائدہ؟''

''مرغ اس وقت تک نہیں بکے گا جب تک میرا دوست ساباس واپس نہیں آ جاتا،'' کرنل نے جواب دیا۔

اس نے الوارو کو بلیرڈ ہال میں رولیٹ کھیلتے پایا۔ اس اتوار کی رات بلیرڈ ہال تپ رہا تھا۔ اونچی آواز میں بجتے ریڈیو کے ارتعاش کی وجہ سے گرمی اَور بھی شدید لگ رہی

تھی۔ کرنل موم جامے کے بڑے سے میز پوش پر رنگے ہوئے، اور میز کے درمیان ایک ڈبے پر رکھی تیل کی لالٹین کی روشنی میں جگمگاتے ہوئے ہندسوں کو دیکھ دیکھ کر اپنا جی خوش کرتا رہا۔ الوارو بار بار تیئیس کے ہندسے پر پیسے لگا کر ہارنے پر مصر تھا۔ اس کے شانے پر سے کھیل کا جائزہ لیتے ہوئے، کرنل نے مشاہدہ کیا کہ پچھلی نو دفعہ کے گھمانے میں گیارہ کا ہندسہ چار بار ظاہر ہوا ہے۔

''گیارہ پر لگاؤ،'' کرنل نے الوارو کے کان میں کہا۔ ''یہی بار بار آ رہا ہے۔''

الوارو نے میز کو غور سے دیکھا۔ اگلی بار اس نے رقم نہیں لگائی۔ اس نے اپنی پتلون کی جیب سے کچھ نقدی، اور کاغذ کا ایک پرزہ نکالا۔ اس نے پرزہ میز کے نیچے سے کرنل کو دیا۔

''آگستین نے بھیجا ہے،'' اس نے کہا۔

کرنل نے خفیہ تحریر اپنی جیب میں ڈال لی۔ الوارو نے گیارہ پر خاصی بڑی رقم لگا دی۔

''تھوڑے پیسوں سے شروع کرو،'' کرنل نے کہا۔

''کیا پتا تمھارا قیاس درست ہو،'' الوارو نے جواب دیا۔ پاس کھڑے چند حواریوں نے دوسرے ہندسوں سے رقمیں اٹھا کر گیارہ پر لگا دیں، حالانکہ رنگدار پہیے نے گھومنا شروع کر دیا تھا۔ کرنل نے اپنے آپ کو مجبور محسوس کیا۔ اسے پہلی مرتبہ جوئے کی کشش، اضطراب اور تلخی کا احساس ہوا۔

اس بار پانچ نمبر آیا۔

''مجھے افسوس ہے،'' کرنل نے احساسِ جرم اور شرمندگی سے بے اختیار ہو کر الوارو سے کہا۔ اس کی نظریں لکڑی کی اس جھانپی پر لگی ہوئی تھیں جس سے میز پر سے الوارو کی لگائی ہوئی رقم سمیٹی جا رہی تھی۔ ''جس بات سے میرا کوئی واسطہ نہیں، اس میں مجھے ٹانگ نہیں اڑانی چاہیے تھی۔''

الوارو کرنل کی طرف دیکھے بغیر مسکرایا۔

''کوئی پروا نہیں کرنل۔ سب چلتا ہے۔''

اچانک، مامبو بجاتے ہوئے بگل خاموش ہو گئے۔ کھلاڑی اپنے ہاتھ ہوا میں اٹھائے تتر بتر ہو گئے۔ کرنل کو اپنے عقب میں بندوق کا گھوڑا چڑھائے جانے کی واضح، کرخت اور سرد آواز سنائی دی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ پولیس کے چھاپے میں پھنس گیا ہے، اور اس کی جیب میں خفیہ اخبار ہے۔ وہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے بغیر تھوڑا سا مڑا۔ تب اس نے بہت قریب سے، زندگی میں پہلی بار، اس شخص کو دیکھا جس نے اس کے بیٹے کو گولی ماری تھی۔ وہ شخص کرنل کے بالکل سامنے تھا اور اس کی بندوق کی نالی کا رخ کرنل کے پیٹ کی طرف تھا۔ وہ چھوٹے سے قد کا، انڈین خدوخال اور موسموں سے سنولائی جلد والا آدمی تھا جس کے سانس سے بچوں جیسی بُو آ رہی تھی۔ کرنل نے اپنے دانت کچکچائے اور آہستگی سے بندوق کی نالی کا رخ اپنی انگلیوں سے موڑ کر دوسری جانب کر دیا۔

''گستاخی معاف،'' اس نے کہا۔

اس نے چمگادڑ کی سی دو چھوٹی چھوٹی گول آنکھوں کا سامنا کیا۔ لمحے بھر میں اسے محسوس ہوا جیسے وہ آنکھیں اسے نگل رہی ہوں، اور پھر فوراً ہی انھوں نے اسے کچل کر

ہضم کر کے باہر نکال دیا ہو۔

''تم جا سکتے ہو، کرنل۔''

6

یہ بتانے کے لیے کہ یہ دسمبر کا مہینہ ہے، اسے کھڑکی کھولنے کی ضرورت نہ تھی۔ جب وہ باورچی خانے میں مرغی کے ناشتے کے لیے پھل کاٹ رہا تھا، اس نے اسے اپنی ہڈیوں میں محسوس کیا۔ تب اس نے دروازہ کھولا، اور صحن کی سمت ایک نظر نے اس کے احساس کی تصدیق کر دی۔ یہ ایک حیرت انگیز صحن تھا، جس میں گھاس اور درخت تھے، اور ڈبے جیسا غسل خانہ جو زمین سے ایک ملی میٹر اوپر تیرتا لگتا تھا۔

عورت نو بجے تک بستر میں رہی۔ جس وقت وہ باورچی خانے میں داخل ہوئی، اس وقت تک کرنل گھر کی صفائی کر چکا تھا، اور مرغ کے اردگرد دائرے کی شکل میں بیٹھے ہوئے بچوں سے باتوں میں مشغول تھا۔ عورت کو چولھے تک پہنچنے کے لیے لمبا چکر کاٹنا پڑا۔

"راستے سے ہٹ جاؤ،" وہ چلّائی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے مرغ کی سمت دیکھا۔ "پتا نہیں اس منحوس سے کب چھٹکارا حاصل ہوگا!"

کرنل نے مرغ کے اوپر سے اپنی بیوی کی کیفیت کا جائزہ لیا۔ مرغ سے خفگی بے جا تھی۔ وہ لڑائی کی مشق کے لیے تیار تھا۔ اس کی گردن اور جامنی پروں والی ٹانگیں، اس کی آری کے دندانوں والی کلغی؛ اس کا بدن چھریرا ہو گیا تھا، اس کا انداز بے مدافعت تھا۔

''کھڑکی سے باہر دیکھو، اور مرغ کو بھول جاؤ،'' بچوں کے جانے کے بعد کرنل نے کہا۔ ''ایسی صبح ہے کہ آدمی کا تصویر کھنچوانے کو جی چاہتا ہے۔''

اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا، مگر اس کے چہرے پر کوئی جذبہ ظاہر نہ ہوا۔ ''میں گلاب لگانا چاہتی ہوں،'' چولھے کی طرف لوٹتے ہوئے وہ بولی۔ کرنل نے شیو بنانے کے لیے آئینہ دیوار پر لٹکایا۔

''گلاب لگانے کو جی چاہ رہا ہے تو لگالو،'' اس نے کہا۔

وہ اپنی حرکات کو آئینے کے ہلنے کے مطابق رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

''مگر انھیں سور کھا جاتے ہیں،'' وہ بولی۔

''اور بھی اچھی بات ہے،'' کرنل نے کہا۔ ''گلابوں پر پلے ہوئے سور زیادہ لذیذ ہونے چاہییں۔''

اس نے آئینے کے کونے میں اپنی بیوی کو دیکھنے کی کوشش کی، اور اسے محسوس ہوا کہ اس کی تلخی برقرار ہے۔ چولھے کی آگ کی روشنی میں اس کا چہرہ چولھے ہی کی طرح کے مادّے کا بنا لگتا تھا۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھے بغیر، اپنی بیوی پر نظریں جمائے، وہ ہمیشہ کی طرح چہرے کو ٹٹول ٹٹول کر شیو بناتا رہا۔ عورت، ایک طویل خاموشی کے دوران، سوچ میں غرق رہی۔

''لیکن میں گلاب نہیں لگانا چاہتی،'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے،'' کرنل نے کہا۔ ''تو پھر مت لگاؤ۔''

کرنل کی طبیعت ٹھیک تھی۔ دسمبر کے آنے سے اس کی انتڑیوں میں اگنے والے

نباتات مرجھا گئی تھیں۔ صبح صبح اسے نئے جوتے پہننے کی کوشش میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کئی دفعہ کوشش کرنے کے بعد جب اسے احساس ہوا کہ یہ فضول ہے تو اس نے اپنے نقلی چمڑے کے جوتے ہی پہن لیے۔ اس کی بیوی نے اس تبدیلی کو محسوس کرلیا۔

''نئے جوتے پہنو گے نہیں تو وہ کبھی ڈھیلے نہیں پڑیں گے،'' اس نے کہا۔

''یہ تو کسی معذور کے جوتے ہیں،'' کرنل نے احتجاج کیا۔ ''لوگوں کو چاہیے کہ ایسے جوتے بیچا کریں جو ایک ماہ تک استعمال کیے جا چکے ہوں۔''

اس دوپہر خط کی آمد کے احساس سے بے تاب ہو کر وہ گلی میں نکل آیا۔ چونکہ لانچوں کے آنے میں ابھی دیر تھی، وہ سا باس کے دفتر میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ اسے بتایا گیا کہ سا باس سوموار سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔ اس غیر متوقع رکاوٹ کے باوجود کرنل نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ''جلد یا بدیر اسے واپس تو آنا ہی ہے،'' اس نے اپنے آپ سے کہا، اور بندرگاہ کی طرف چل پڑا؛ یہ ایک حیرت انگیز لمحہ تھا، جس میں اس کی ہوشمندی سالم اور بے داغ تھی۔

''دسمبر کا مہینہ سارے سال چلنا چاہیے،'' موسیٰ شامی کی دکان میں بیٹھے ہوے وہ منہ ہی منہ میں بولا۔ ''آدمی کو یوں لگتا ہے جیسے وہ کانچ کا بنا ہوا ہو۔''

موسیٰ کو یہ تصور اپنی بھولی بسری عربی میں ترجمہ کرنے میں قدرے محنت کرنا پڑی۔ وہ ہموار، کھنچی ہوئی جلد میں اپنے کانوں تک لپٹا، ایک حلیم الطبع مشرقی تھا، اور اس کی حرکات کسی ڈوبتے ہوے شخص کی حرکات کی طرح کڈھب تھیں۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسے ابھی کھینچ کر پانی سے باہر نکالا گیا ہو۔

''پہلے یوں ہی ہوتا تھا،'' اس نے کہا۔ ''وہی حال رہتا تو میری عمر اس وقت آٹھ سو ستانوے سال ہوتی۔ اور تمھاری؟''

''پچھتر سال،'' کرنل نے کہا، اس کی آنکھیں پوسٹ ماسٹر کا پیچھا کر رہی تھیں۔ اس وقت اسے سرکس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے ڈاک والی لانچ کی چھت پر بہت سی رنگ برنگی چیزوں کے درمیان سرکس کے پیوند لگے خیمے کو پہچان لیا۔ دوسری لانچوں پر اوپر تلے رکھے ڈبوں میں جنگلی جانوروں کو ڈھونڈنے کی کوشش میں، پوسٹ ماسٹر ایک لمحے کے لیے اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اسے جانور نظر نہ آئے۔

''یہ سرکس ہے!'' وہ بولا۔ ''یہ پہلا سرکس ہے جو پچھلے دس برس میں آیا ہے۔''

موسیٰ شامی نے اس کی تصدیق کی۔ وہ ملی جلی عربی اور ہسپانوی میں اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔ اس نے دکان کے عقبی حصے سے اسے جواب دیا۔ اس نے اپنے آپ سے کچھ کہا، اور پھر اپنی فکرمندی کا ترجمہ کر کے کرنل کو بتایا۔

''اپنی بلی کو چھپا لو، کرنل۔ ورنہ لڑکے اسے چرا کر سرکس میں بیچ دیں گے۔''

کرنل اٹھ کر پوسٹ ماسٹر کے پیچھے جانے کو تھا۔

''یہ جنگلی جانوروں کا تماشا نہیں ہے،'' اس نے کہا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا،'' شامی نے جواب دیا۔ ''رسے پر چلنے والے بلیاں کھاتے ہیں تاکہ اپنی ہڈیاں نہ توڑ بیٹھیں۔''

وہ پوسٹ ماسٹر کے پیچھے پیچھے ساحل پر دکانوں کے درمیان سے گزرتا ہوا چوک تک آ پہنچا۔ وہاں مرغوں کی لڑائی جیسے شور نے اسے تعجب میں ڈال دیا۔ اس کے پاس

سے گزرتے ہوئے ایک شخص نے اس کے مرغ کے بارے میں کچھ کہا۔ تب اسے یاد آیا کہ آج مرغوں کی جانچ پرکھ کا دن ہے۔

وہ ڈاک خانے کے سامنے سے گزر گیا۔ ایک لمحے بعد وہ مرغوں کی لڑائی کی پالی کے شوروغل میں گم ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے مرغ کو پالی میں اکیلا اور بے مدافعت کھڑا دیکھا: اس کے پنجوں پر دھجیاں لپٹی ہوئی تھیں اور اس کے کانپتے پیروں سے خوف جیسی کوئی شے ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کا حریف ایک اداس خاکستری مرغ تھا۔

کرنل کو کوئی جذبہ محسوس نہ ہوا۔ مرغ ایک دوسرے پر ایک ہی طریق سے حملہ آور ہوئے۔ لوگوں کی پُرجوش دادوتحسین کے درمیان، ان کے پر، پنجے اور گردنیں چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے میں گتھ گئیں۔ پالی کی باڑھ سے ٹکرا کر حریف مرغ نے قلابازی کھائی، اور لوٹ کر پھر حملہ آور ہوا۔ اس کے مرغ نے حملہ نہ کیا، بلکہ ہر حملے کی مدافعت کر کے اپنی جگہ واپس آتا رہا۔ مگر اب اس کے پاؤں نہیں کانپ رہے تھے۔

ایرنان نے باڑھ پھلانگی، اسے دونوں ہاتھوں میں اٹھایا، اور تماشائیوں کے ہجوم کے سامنے اس کی نمائش کرنے لگا۔ لوگوں نے دیوانہ وار تحسین کے نعرے بلند کیے۔ کرنل نے لوگوں کی داد کے ولولے اور مرغوں کی لڑائی کی شدت میں عدم تناسب کو محسوس کر لیا۔ اسے یہ سب ایک سوانگ معلوم ہوا، جس میں دونوں مرغوں نے خود کو — ارادی اور شعوری طور پر — شریک ہو جانے دیا تھا۔

کچھ کچھ حقارت آمیز تجسس سے مجبور ہو کر اس نے لڑائی کی دائرہ نما پالی کا جائزہ لیا۔ پُرجوش مجمع نشستوں سے ایک دوسرے کو دھکیلتا، نیچے پالی کی طرف آ رہا تھا۔ کرنل

نے پر جوش، بے تاب اور مکمل طور پر زندہ چہروں کے اس ہجوم کی ابتری کا مشاہدہ کیا۔ وہ سب نئے لوگ تھے۔ قصبے کے تمام نئے باشندے۔ اس نے — ایک پیش آ گہی کے ساتھ — ایک ایسے لمحے کو ایک بار پھر بسر کیا جو اس کی یادداشت کے سرے پر محو ہو چکا تھا۔ تب وہ باڑھ پھلانگ کر ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا پالی کے وسط میں جا پہنچا اور ایرنان کی پر سکون آنکھوں کا سامنا کیا۔ وہ دونوں آنکھیں جھپکائے بغیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

''سہ پہر بخیر، کرنل۔''

کرنل نے مرغ کو اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ''سہ پہر بخیر،'' وہ بڑبڑایا۔ وہ اور کچھ نہ بولا کیونکہ اس جاندار کے گرم اور گہرے ارتعاش نے اس پر کپکپی طاری کر دی تھی۔ اسے خیال آیا کہ اس نے اس سے پہلے کبھی اس سے زیادہ زندہ شے اپنے ہاتھوں میں نہیں لی۔

''تم گھر پر نہیں تھے،'' ایرنان گڑبڑا کر بولا۔

دادو تحسین کے ایک نئے شور نے اس کی بات کاٹ دی۔ کرنل کو ڈر سا محسوس ہوا۔ اس نے ہجوم میں سے، کسی کی طرف دیکھے بغیر، تحسین کے نعروں اور شور وغل سے سہم کر، ایک بار پھر راستہ بنانا شروع کیا: وہ مرغ کو بغل میں دبائے گلی میں نکل آیا۔

سارا قصبہ — نچلے طبقے کے لوگ — اسے گزرتا دیکھنے کے لیے باہر نکل آیا: اس کے پیچھے پیچھے اسکول کے بچے تھے۔ چوک کے کونے پر ایک دیو قامت نیگرو اپنی گردن کے گرد سانپ لپیٹے، میز پر کھڑا، لائسنس کے بغیر دوائیں بیچ رہا تھا۔ بندرگاہ سے

واپس آتے ہوئے لوگوں کا ایک بڑا مجمع اس کے اردگرد کھڑا اس کے قصے سن رہا تھا۔ لیکن جب کرنل مرغ اٹھائے ان کے پاس سے گزرا تو سب کی توجہ اس کی طرف ہوگئی۔ گھر کا راستہ کبھی اتنا طویل نہیں ہوا تھا۔

اسے کوئی تاسف نہ تھا۔ ایک طویل عرصے تک یہ قصبہ، دس برس کی تاریخ کی دست بُرد کا شکار، بے ہوشی کے عالم میں رہا تھا۔ اس سہ پہر — بغیر خط کے ایک اَور جمعے کی سہ پہر — لوگ جاگ اٹھے تھے۔ کرنل کو ایک اَور زمانے کی یاد آئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ ایک بڑی چھتری کے نیچے بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے، جو بارش کے باوجود جاری ہے۔ اس نے پارٹی کے رہنماؤں کو یاد کیا، جو نہایت احتیاط کے ساتھ بنے سنورے، اس کے گھر کے دالان میں موسیقی کی تال پر اپنے آپ کو پنکھا جھل رہے تھے۔ اس نے ڈھول کی اذیت ناک دھمک کو اپنی انتڑیوں میں تقریباً پھر سے بسر کیا۔

وہ گودی کے متوازی سڑک پر چلتا گیا، اور وہاں بھی اس نے بہت پہلے کے الیکشن کے ایک اتوار کا پُرآشوب ہجوم دیکھا۔ لوگ سرکس کو اترتے دیکھ رہے تھے۔ ایک خیمے کے اندر سے کسی عورت نے چیخ کر مرغ کے بارے میں کچھ کہا۔ وہ اپنے آپ میں گم، گھر کی طرف چلتا رہا: اسے سارے راستے بکھری ہوئی آوازیں سنائی دیتی رہیں، جیسے پالی کے نعروں کی باقیات اس کا پیچھا کر رہی ہوں۔

دروازے پر وہ لڑکوں سے مخاطب ہوا:

"تم سب گھر جاؤ،" اس نے کہا۔ "جو کوئی اندر آیا اس کی چمڑی ادھیڑ دی جائے گی۔"

اس نے دروازہ بند کیا اور سیدھا باورچی خانے میں گیا۔ اس کی بیوی، بے ترتیب سانسوں کے ساتھ خوابگاہ سے نکلی۔

''وہ اسے زبردستی لے گئے،'' اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ان سے کہا کہ جب تک میں زندہ ہوں، مرغ اس گھر سے باہر نہیں جائے گا۔'' کرنل نے مرغ کو چولھے کے پائے سے باندھ دیا۔ اس کا پانی بدلتے ہوئے، اس کی بیوی کی غضبناک آواز اس کا پیچھا کرتی رہی۔

''انھوں نے کہا، وہ اسے ہماری لاشوں پر سے گزر کر بھی لے جائیں گے،'' وہ بولی۔ ''انھوں نے کہا، مرغ ہمارا نہیں، پورے قصبے کا ہے۔''

مرغ کے کاموں سے فارغ ہو کر ہی کرنل نے اپنی بیوی کے اینٹھے ہوئے چہرے کی طرف توجہ دی۔ اس پر، بغیر کسی تعجب کے، انکشاف ہوا کہ اسے دیکھ کر نہ اسے افسوس ہوا اور نہ ہمدردی۔

''انھوں نے ٹھیک کیا،'' اس نے آہستہ سے کہا۔ اور پھر اپنی جیبوں میں کچھ تلاش کرتے ہوئے وہ ایک قسم کی اتھاہ مٹھاس کے ساتھ بولا:

''مرغ بیچنے کے لیے نہیں ہے۔''

وہ اس کے پیچھے پیچھے خوابگاہ میں آئی۔ وہ اسے مکمل طور پر انسان، لیکن رسائی سے باہر محسوس ہوا، جیسے وہ اسے سنیما کے پردے پر دیکھ رہی ہو۔

کرنل نے الماری میں سے گول کر کے رکھے ہوئے چند نوٹ نکالے، اپنی جیبوں میں موجود رقم ان میں شامل کی، سارے نوٹوں کو گنا، اور الماری میں واپس رکھ دیا۔

''میرے دوست ساباس کو لوٹانے کے لیے انتیس پیسو ہیں،'' اس نے کہا۔''باقی کی رقم اسے میری پنشن آنے پر ملے گی۔''

''لیکن اگر تمھیں پنشن نہ ملی تو؟'' عورت نے پوچھا۔

''ملے گی۔''

''لیکن اگر نہ ملی تو؟''

''تو پھر، اسے باقی رقم کی ادائیگی نہیں ہوگی۔''

اس نے بستر کے نیچے سے جوتوں کا نیا جوڑا نکالا۔ پھر جوتوں کا خالی ڈبہ لینے الماری کے پاس گیا، جوتوں کے تلے ایک چیتھڑے سے صاف کیے، اور جوتوں کو ڈبے میں اسی طرح رکھ دیا جیسے اس کی بیوی انھیں اتوار کی رات کو لائی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

''جوتے واپس کیے جائیں گے،'' کرنل نے کہا۔''اس طرح میرے دوست ساباس کے لیے تیرہ پیسو کا اور انتظام ہو گیا۔''

''وہ انھیں واپس نہیں لیں گے،'' وہ بولی۔

''انھیں لینے ہوں گے،'' کرنل نے جواب دیا۔''میں نے صرف دو بار پہنے ہیں۔''

''ترک ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے،'' عورت نے کہا۔

''انھیں سمجھنا ہوگا۔''

''اگر وہ نہ سمجھیں تو؟''

''تو پھر نہ سہی!''

وہ کھانا کھائے بغیر بستر پر گئے۔ کرنل نے اپنی بیوی کی تسبیح کے ختم ہونے کا انتظار کیا تا کہ لیمپ بجھا سکے۔ لیکن وہ سو نہ سکا۔ اس نے فلم کے سنسر کی گھنٹیاں سنیں، اور تقریباً اچانک — تین گھنٹے بعد — کرفیو کا بگل سنا۔ رات کی سرد ہوا سے اس کی بیوی کے سانس کا کرب اَور بڑھ گیا تھا۔ کرنل کی آنکھیں کھلی تھیں، جب وہ اس سے دھیمے، صلح جُو لہجے میں مخاطب ہوئی:

''تم جاگ رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''سمجھ بوجھ سے کام لو،'' اس نے کہا۔ ''کل جا کر سابااس سے بات کرلو۔''

''وہ سوموار سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔''

''بہتر ہے،'' عورت بولی۔ ''اس طرح تمھیں سوچنے کے لیے تین دن مل جائیں گے۔''

''سوچنے کے لیے کچھ نہیں ہے،'' کرنل نے کہا۔

اکتوبر کی چپچپاہٹ کی بجائے اب ہوا میں خوشگوار خنکی تھی۔ پلوور پرندوں کی آمدورفت کے بندھے ٹکے معمول سے کرنل نے دسمبر کو ایک بار پھر پہچانا۔ رات دو بجے تک وہ نیند سے کوسوں دور تھا۔ لیکن اسے علم تھا کہ اس کی بیوی بھی جاگ رہی ہے۔ اس نے جھولنے میں کروٹ بدلنے کی کوشش کی۔

''تمھیں نیند نہیں آرہی ہے،'' عورت نے کہا۔

''نہیں۔''

وہ ایک لمحے سوچتی رہی۔

''ہم ایسا کرنے کی صورت حال میں نہیں ہیں،'' وہ بولی۔ ''ذرا سوچو، چار سو پیسو کی یک مشت رقم کتنی ہوتی ہے!''

''اب پنشن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی،'' کرنل نے کہا۔

''تم پندرہ سال سے یہی کہتے آ رہے ہو۔''

''اسی لیے تو،'' کرنل نے کہا۔ ''اب زیادہ دیر نہیں ہے۔''

وہ خاموش رہی۔ لیکن جب اس نے دوبارہ بات کی تو کرنل کو کوئی وقفہ محسوس نہ ہوا۔

''مجھے لگتا ہے پنشن کبھی نہیں ملے گی،'' عورت نے کہا۔

''ملے گی۔''

''اور اگر نہ ملی تو؟''

کرنل اس کا جواب نہ دے سکا۔ مرغ کی پہلی بانگ کے ساتھ اسے حقیقت کا احساس ہوا، مگر وہ دوبارہ دبیز، محفوظ اور بے تاسف نیند میں ڈوب گیا۔ جب وہ اٹھا تو دن چڑھ چکا تھا۔ اس کی بیوی سو رہی تھی۔ کرنل نے باقاعدگی کے ساتھ صبح کے تمام فریضے ہر روز کی طرح، مگر دو گھنٹے دیر سے، پورے کیے اور ناشتے کے لیے اپنی بیوی کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔

جب وہ اٹھی تو بہت کم گو تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو صبح بخیر کہا، اور خاموشی

سے ناشتے کے لیے بیٹھ گئے۔ کرنل نے پنیر اور میٹھا بن کھایا اور بغیر دودھ کی کافی کا پیالہ پیا۔ صبح کا باقی تمام وقت اس نے درزی کی دکان پر بیٹھ کر گزارا۔ ایک بجے وہ گھر واپس آیا، اور اپنی بیوی کو بیگونیا کے گملوں کے درمیان کپڑے رفو کرتے ہوئے پایا۔

''دوپہر کے کھانے کا وقت ہے،'' اس نے کہا۔

''کھانا نہیں ہے۔''

کرنل نے کندھے اچکائے۔ وہ صحن کی دیوار کے ان سوراخوں کو بند کرنے کی کوشش کرنے لگا جن سے بچے باورچی خانے میں گھس آیا کرتے تھے۔ جب وہ دوبارہ دالان میں آیا تو کھانا میز پر رکھا تھا۔

کھانا کھانے کے دوران کرنل کو احساس ہوا کہ اس کی بیوی بہت کوشش سے رونے سے گریز کر رہی ہے۔ اس یقینی بات سے وہ چونک اٹھا۔ وہ اپنی بیوی کی طبیعت سے واقف تھا، جو فطری طور پر سخت تھی، اور تلخی کے چالیس برسوں نے اسے اَور بھی سخت کر دیا تھا۔ اپنے بیٹے کی موت پر بھی اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہ نکلا تھا۔

اس نے اپنی پُرملامت نگاہ اپنی بیوی کی آنکھوں پر مرکوز کر دی۔ وہ اپنے ہونٹ کترتی، آستین سے اپنی پلکیں پونچھتی، کھانا کھاتی رہی۔

''تمھیں کسی کا کوئی خیال نہیں ہے،'' اس نے کہا۔

کرنل کچھ نہ بولا۔

''تم خودسر، ضدی اور خودغرض ہو،'' اس نے دہرایا۔ اس نے اپنے چھری کانٹے رکابی میں ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیے، مگر فوراً ہی اپنے توہم کے زیرِ اثر انھیں سیدھا

کردیا۔ ''ساری عمر میں نے اس لیے بھاڑ جھونکا تھا کہ اب آ کر مجھے معلوم ہو کہ میری وقعت ایک مرغ سے بھی کم ہے۔''

''یہ اَور معاملہ ہے،'' کرنل نے کہا۔

''یہ ایک ہی معاملہ ہے،'' عورت نے جواب دیا۔ ''تمھیں اتنا تو خیال ہونا چاہیے کہ میں مرنے والی ہوں: میرا یہ مرض دراصل آہستہ آہستہ آتی ہوئی موت ہے۔''

جب تک کرنل نے کھانا ختم نہیں کرلیا، کچھ نہ بولا۔

''اگر ڈاکٹر مجھے یہ ضمانت دے دے کہ مرغ بیچنے سے تمھارا دمہ ٹھیک ہو جائے گا، تو میں اسے ابھی بیچ دوں گا،'' اس نے کہا۔ ''ورنہ نہیں۔''

اس سہ پہر وہ مرغ کو لڑائی کی پالی میں لے گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی کو دمے کے دورے کے قریب پایا۔ وہ بازو پھیلائے، بال کھولے، بے چینی میں دالان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگاتی، اپنے پھیپھڑوں کی سیٹیوں پر قابو پانے اور اپنا سانس درست کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شام تک وہ اسی حالت میں رہی۔ پھر اپنے خاوند سے بات کیے بغیر، وہ جا کر بستر میں لیٹ گئی۔

کرفیو شروع ہونے کے کچھ دیر بعد تک وہ دعائیں پڑھتی رہی۔ کرنل نے لیمپ بجھانا چاہا، مگر اس نے اعتراض کیا۔

''میں اندھیرے میں نہیں مرنا چاہتی،'' اس نے کہا۔

کرنل نے جلتے ہوئے لیمپ کو فرش پر رہنے دیا۔ اسے تھکن محسوس ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ سب کچھ فراموش کر کے چوالیس دن کے لیے سو جائے، اور بیس جنوری

کی سہ پہر تین بجے، پالی میں جاگے تاکہ عین وقت پر مرغ کو لڑائی کے لیے اتار سکے۔ لیکن اسے اپنی بیوی کی متوقع بے خوابی سے ڈر محسوس ہوا۔

''وہی پرانی کہانی ہے،'' ایک لمحے بعد وہ بولنے لگی۔ ''ہم بھوکے رہتے ہیں تاکہ دوسروں کا پیٹ بھر سکیں۔ چالیس برس سے یہی ہو رہا ہے۔''

کرنل خاموش رہا، یہاں تک کہ اس کی بیوی یہ پوچھنے کو رکی کہ آیا وہ جاگ رہا ہے۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ تب عورت نے اطمینان اور روانی اور کٹھور پن سے اپنی بات جاری رکھی۔

''ہر شخص مرغ پر پیسہ لگا کر جیت جائے گا، ہمارے سوا۔ صرف ہم ہیں جن کے پاس مرغ پر لگانے کے لیے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔''

''مرغ کا مالک منافعے میں سے بیس فیصد کا حقدار ہوتا ہے۔''

''الیکشن میں دن رات کام کرنے کے بعد تم کسی عہدے کے بھی حقدار تھے،'' عورت نے جواب دیا۔ ''خانہ جنگی میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر سپاہیوں کی پنشن کے بھی حقدار تھے۔ اب سب کی زندگیاں بن گئی ہیں، اکیلے تم ہو جو بھوکے مر رہے ہو۔''

''میں اکیلا نہیں ہوں،'' کرنل نے کہا۔

اس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی، مگر نیند نے اس پر غلبہ پالیا۔ وہ یک آہنگی کے ساتھ دیر تک بولتی رہی یہاں تک کہ اسے احساس ہوا کہ اس کا خاوند سو چکا ہے۔ تب وہ مچھر دانی سے نکلی اور بیٹھک کے اندھیرے میں اِدھر اُدھر پھرتی رہی۔ وہاں بھی وہ اپنے آپ سے باتیں کرتی رہی۔ سورج نکلنے کے وقت کرنل نے اسے آواز دی۔

بجھے ہوئے لیمپ کی نیچے سے پڑتی ہوئی روشنی میں وہ ایک روح کی طرح دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس نے مچھر دانی میں داخل ہونے سے پہلے لیمپ بجھا دیا۔ مگر وہ بولتی رہی۔

''ہم ایک کام کر سکتے ہیں،'' کرنل نے اس کی بات کاٹی۔

''ہم صرف ایک کام کر سکتے ہیں کہ مرغ کو بیچ دیں،'' عورت نے کہا۔

''ہم گھڑی بھی تو بیچ سکتے ہیں۔''

''اسے کوئی نہیں خریدے گا۔''

''کل میں الوارد سے پوچھوں گا اگر وہ مجھے چالیس پیسو دے سکے۔''

''وہ نہیں دے گا۔''

''تب ہم تصویر بیچ سکتے ہیں۔''

اس بار کرنل کی بیوی بات کرنے کے لیے مچھر دانی سے باہر نکل آئی۔ کرنل کو اپنی بیوی کے دواؤں اور جڑی بوٹیوں سے آلودہ سانس کی بو آئی۔

''اسے کوئی نہیں خریدے گا،'' وہ بولی۔

''دیکھیں گے،'' کرنل نے نرمی سے اور اپنے لہجے میں کوئی تبدیلی لائے بغیر کہا۔

''اب جا کر سو جاؤ۔ کل اگر کوئی چیز بھی نہ بک سکی تو کوئی اَور طریقہ سوچیں گے۔''

کرنل نے اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی مگر نیند نے اس کے ارادے کو خاک میں ملا دیا۔ وہ وقت اور مقام کے احساس سے دور، ایک ایسی کیفیت کی تہہ میں جا گرا جہاں اس کی بیوی کے الفاظ نے ایک مختلف مفہوم اختیار کر لیا۔ مگر ایک لمحے کے بعد

اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کا کندھا ہلا رہا ہو۔

''میری بات کا جواب دو۔''

کرنل کو علم نہ ہو سکا کہ یہ الفاظ اس نے نیند میں جانے کے بعد سنے تھے یا اس سے پہلے۔ صبح طلوع ہو رہی تھی۔ نتھری اور شفاف صبح کی سرسبزی میں کھڑکی کی شکل واضح تھی۔ اس نے سوچا شاید اسے بخار ہے۔ اس کی آنکھیں تپ رہی تھیں اور اپنے ذہن کا ابہام دور کرنے میں اسے بہت دقت کا سامنا ہوا۔

''اگر ہم کچھ بھی نہ بیچ سکے تو کیا کریں گے؟'' اس کی بیوی نے اپنا سوال دہرایا۔

''تب تک بیس جنوری کا دن آ چکا ہوگا،'' کرنل نے کہا؛ وہ اب پوری طرح بیدار تھا۔ ''اور مرغوں کی لڑائی کے منافعے میں سے بیس فیصد اسی شام ہمیں مل جائے گا۔''

''اگر مرغ جیت گیا تو،'' عورت نے کہا۔ ''اور اگر وہ ہار گیا تو کیا ہوگا؟ تم نے یہ سوچا تک نہیں کہ وہ ہار بھی سکتا ہے۔''

''وہ ایسا مرغ ہے جو نہیں ہار سکتا۔''

''فرض کرو وہ ہار گیا تو؟''

''اس بارے میں سوچنے کو ابھی چوالیس دن پڑے ہیں،'' کرنل نے کہا۔

اس کی بیوی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

''اور اس عرصے میں، ہم کھائیں گے آخر کیا؟'' اس نے پوچھا، اور کرنل کو اس کی فلالین کی قمیص کے کالر سے پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا۔

اس ایک لمحے تک پہنچنے میں کرنل کو پچھتر برس لگے تھے، ایک ایک لمحہ کر کے بسر

کیسے ہوئے اس کی زندگی کے پچھتر برس۔ جواب دینے کے لمحے میں اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر پاک صاف، واضح اور ناقابلِ تسخیر محسوس کیا۔

''گو،'' اس نے کہا۔

گابریئل گارسیا مارکیز

بڑی ماما کا جنازہ

اور دوسری کہانیاں

✲

ایک پیش گفتہ موت کی روداد

(ناول)

گابریئل گارسیا مارکیز

معصوم اریندرا

اور دوسری کہانیاں

تنہائی کے سو سال

(ناول)
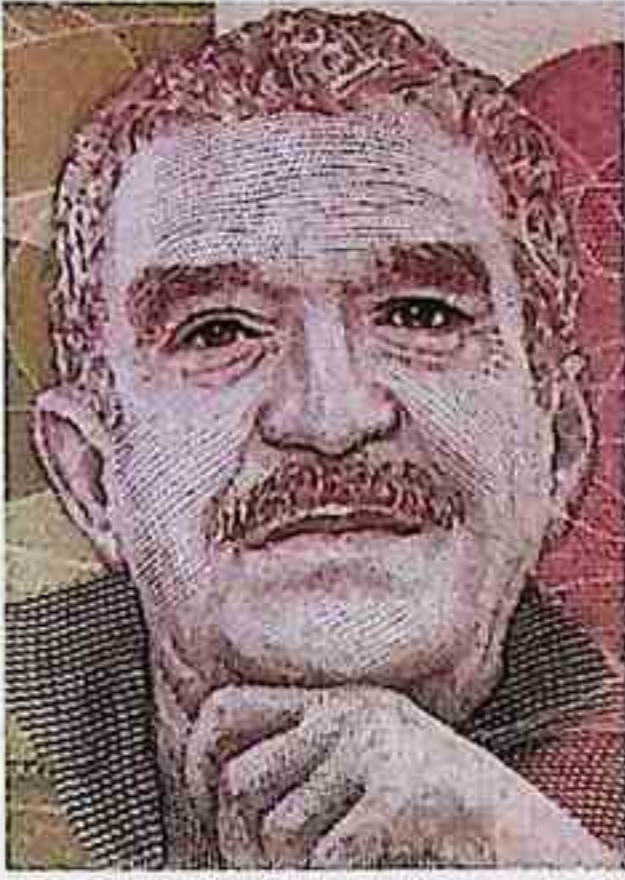
لاطینی امریکی ملک کولمبیا کے مشہورِ عالم ادیب گابریئل گارسیا مارکیز (1927-2014) کے ناول کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا کا پس منظر اس ملک کے روایت پرست (کنزرویٹو) اور تبدیلی پسند (لبرل) گروہوں کی وہی برسوں طویل مسلح خانہ جنگی ہے جس کا مارکیز کے ناول تنہائی کے سو سال میں تفصیلی تذکرہ آیا ہے۔ اس کشمکش میں لبرل گروہ کو نہ صرف فوجی شکست ہوئی بلکہ جیتنے والے کنزرویٹو گروہ نے اسے موقع پرستی میں مبتلا کر کے اپنے اندر ضم کر لیا۔ اس ناول کا مرکزی کردار ایک کرنل ہے جو کئی دہائیوں سے، امید اور مایوسی کے درمیان ڈولتا ہوا، اس خط کا انتظار کر رہا ہے جو اس خانہ جنگی میں حصہ لینے کے صلے میں اسے پنشن کا حقدار ٹھہرائے گا۔ مارکیز کے اس ناول کا ترجمہ فاروق حسن نے کیا تھا جنھوں نے اپنی عملی زندگی کا بڑا حصہ کینیڈا میں گزارا اور چند برس پہلے وہیں وفات پائی۔ زیرِ نظر ترجمہ بھی ان کے دیگر ترجموں کے ساتھ آج کے خصوصی شمارہ 7 (1991) میں شامل تھا جو بعد میں گابریئل گارسیا مارکیز: منتخب تحریریں کے عنوان سے کتاب کی صورت میں شائع ہوا۔

ISBN: 978-969-648-072-3